فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	نیت اور اعمال	ڈاکٹر مقبول احمد شاہد	8
قولِ نبی ﷺ	فضائلِ قرآن	عظمیٰ پروین	12
خاص مضمون	قیام پاکستان، چند تاریخی حقائق	ڈاکٹر محمد آفتاب خان	15
نوائے شوق	عمر کا تقاضا ہے	نجمہ یاسمین یوسف	27
	غزل	حبیب الرحمٰن	28
	غزل	آمنہ رمیصا زاہدی	28
حقیقت و افسانہ	میرا سفر	قانتہ رابعہ	29
	تین چیزیں	قمر پرویز	33
	بھول	فرحی نعیم	36
سلسلہ وار کہانی	سفر شناس	نصرت یوسف	48
انتخاب	مامتا	شاہدہ ناز قاضی	54
نہاں خانۂ دل	لامکاں	افشاں نوید	58
	دو دروازے	فرحت طاہر	60
سیر و سیاحت	آکاش سے پرے (قسط۲)	غزالہ ارشد	63
زباں و ادب	خوبصورت اور یادگار نظموں کا شاعر رحمان کیانی	حبیب الرحمٰن	70
گزرا ہوا زمانہ	محبت کا گماں گزرے	شمیم لودھی	73
پل صراط پر	مجھے جانیے	تزئین فیصل	75
بتول میگزین	قمر پرویز، درشہوار قادری		77
گوشۂ تسنیم	ہوسٹل	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	79
منتخب کالم	اولاد کے حقوق	علامہ ابتسام الٰہی ظہیر	80

ابتدا تیرے نام سے

قارئینِ کرام!

ملک سیلابوں میں ڈوبا ہوا ہے۔اس موسم کی بارشیں کہیں خوشیاں اور تازگی لاتی ہیں تو کہیں دکھوں اور مصیبتوں کے لامتناہی سلسلے۔گھر،مویشی،سازوسامان،فصلیں یہاں تک کہ بہت سی جانیں بھی سیلابی ریلوں کی نذر ہو جاتی ہیں اور اچھے بھلے رہتے بستے لوگ بے آسرا، در بدر ہو جاتے ہیں۔ہمارے ہمسایوں کا کرم، کہ اوپر سے دریاؤں کا پانی بھی چھوڑ دیا جاتا ہےاورصورت حال سنگین تر ہو جاتی ہے۔اس آبی جارحیت کا کیا رونا! دشمن تو دشمنی ہی کرے گا۔خبر تو تب بنتی ہے جب انسان کتے کو کاٹے۔اور پھر رونے کے سوا آج تک ہم نے کیا ہی کیا ہے!

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

نہ ڈیم بنیں گےاور نہ پانی کی مینجمنٹ ہوگی۔اس وقت پورا سندھ اور آدھا پنجاب سیلابوں کی زد میں ہے۔پانی عذابِ الٰہی بن گیا ہے۔چند ماہ بعد یہی علاقے پانی کی کمی کا شکار ہوں گے۔کہیں انسانوں کو پانی نہیں ملے گا تو کہیں فصلوں کو۔سالہا سال سے ان حالات کا براہِ راست اثر ہماری معیشت پر مرتب ہو رہا ہے۔ہم ترقی کیا خاک کریں گے! ہارونؔ الرشید کے اشعار کی زبانی

ہجر کے اک نگر میں گزرا ہے	وقت سارا ہی ڈر میں گزرا ہے
میں وہ خانہ بدوش ہوں جس کا	اک زمانہ سفر میں گزرا ہے
جانے کب سانحہ کوئی ہو جائے	ایک اک لمحہ ڈر میں گزرا ہے
اپنے بچے نظر نہیں آئے	کیسا دن ہے جو گھر میں گزرا ہے
حال مت پوچھ میری کشتی کا	اس کا ہر دن بھنور میں گزرا ہے

یومِ آزادی کا مہینہ اس عزم کا اعادہ کرنے کا موقع دیتا ہے کہ ہم تخلیقِ پاکستان کے مقاصد کا حصول اپنا مطمحِ نظر بنائیں گے،اور اس کے لیے ہر سطح پر اپنی سی کوشش ضرور کریں گے،خواہ حالات کتنے ہی مشکل کیوں نہ ہوں۔پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی تکمیل ہماری سعی و جہد کا مرکز رہے گی اور اس کے لیے ہم اپنی انفرادی و اجتماعی کوششوں میں تمام دستوری ذرائع کو بروئے کار لائیں گے۔

فکاہیہ اور طنز و مزاح پر مبنی تحریریں ادب کا ایک اہم حصہ ہیں۔یہ صرف تفریحِ طبع کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ سلیقہِ اظہار کی ضرورت کے تحت تخلیق کی جاتی ہیں۔مزاح کے پردے میں بڑی سے بڑی تلخ بات قابلِ ہضم بنا کر کہی جاسکتی ہے۔اپنے اوپر ہنسنے کی جرأت رکھنے والے معاشرے کشادہ دل اور عالی ظرف ہوتے ہیں۔شگفتہ پیرائے میں کہی گئی بات کئی بار قاری کے لیے سنجیدہ تحریر کی نسبت زیادہ اثر انگیز ثابت ہوتی ہے۔مزاحیہ ادب یہی خدمت انجام دیتا ہے۔ہمارے ہاں اس نوعیت کے ادب میں بڑے بڑے نام

موجود رہے ہیں جنہوں نے بے مثال فکاہیہ ادب پارے اور مزاحیہ کردار تخلیق کیے ۔سید امتیاز علی تاج، شوکت تھانوی، پطرس بخاری، سید ضمیر جعفری، مشتاق یوسفی، کرنل محمد خان، شفیق الرحمان، کرنل اشفاق حسین چند بڑے نام ہیں جو ہمارے ہاں نو آموز لکھاریوں کے لیے دبستان کا درجہ رکھتے ہیں۔

بتول میں ہم نے اس صنفِ ادب کے لیے بھی ایک کالم مخصوص کر رکھا ہے۔اس کالم کا نام ’’ہلکا پھلکا‘‘ رکھا گیا ہے تاکہ اگر طنز و مزاح کے ادبی پیمانے پورے نہ ہوسکیں تو کم از کم کوئی شگفتہ نوعیت کی تحریر ہی اس کے تحت شائع ہوسکے۔مگر اس کالم کے لیے ہمیں سب سے کم تحریریں موصول ہوتی ہیں اور ان میں سے بھی انتخاب کے بعد کئی بار تو کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ہم اپنے لکھنے والوں کی توجہ اس طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ہاں لکھنے والوں میں اس نوع کی تحریروں کو کمتر سمجھنے اور ان کی اہمیت کا اندازہ لگانے میں کوتاہی کرنے کا رجحان ہے۔اس سلسلے میں ہمارا نقطہِ نظر تبدیل ہونے کی ضرورت ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہمارے مجموعی حالات کے باعث طبیعت میں شگفتگی کا عنصر دبتا جا رہا ہے اور اظہار میں تلخی اور شدت بڑھتی جا رہی ہے۔اس معاملے میں یہ بات مدنظر رہنی چاہیئے کہ حالات کی سنگینی مزاحیہ ادب کی اہمیت کو اور بڑھا دیتی ہے۔اور ہم پر تو ابھی اللہ کا کرم ہے کہ وہ کچھ نہیں گزرا جو اقوام عالم پر گزرتا ہے۔حالات جتنے بھی تلخ ہوں مسکرانے کا ہنر یاد رکھنا انسان کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتا ہے۔

ایک اور وجہ یہ بھی محسوس ہوتی ہے کہ ہم لکھنے پر محنت نہیں کرتے۔مزاحیہ ادب تخلیق کرنا جس نوعیت کی محنت اور توجہ مانگتا ہے، ہم اس کے عادی نہیں ہیں۔اس کی بجائے ایک سنجیدہ تحریر لکھ کر ہم اپنے تئیں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ہر لکھاری کا فرض اس کی صلاحیتوں اور امکانات کے مطابق ہے اور اسی اعتبار سے اسے فرض کی ادائیگی کی فکر کرنی چاہیئے۔

پھر سوشل میڈیا نے بھی لکھنے کی طرف رجحان کو متاثر کیا ہے۔ہم اپنی ہر قسم کی بھڑاس چند جملوں میں نکال کر فارغ ہو جاتے ہیں، اور اسی قسم کا عجلت پسندانہ اظہار ہر طرف سے پڑھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ سوشل میڈیا پر دیا جانے والا ہر پیغام ہزاروں اور لاکھوں تک نہیں پہنچتا۔ہم نے اپنے جس احساس کو اس عجلت پسندی کی نظر کیا، شاید اس کا تاثر قبول کرنے والے گنتی کے لوگ ہوں۔جبکہ یہی خیال اگر تھوڑی محنت کے بعد کسی باقاعدہ صنفِ ادب میں ڈھل جاتا تو اس کی اثر انگیزی کئی گنا بڑھ جاتی، پھر بھلے وہ شائع ہو یا سوشل میڈیا پر چلے، آپ کا پیغام خود بخود لاکھوں تک پہنچے گا۔احساس ایک قیمتی متاع ہے۔جس کے پاس لکھنے کا ہنر ہو، اسے اس قیمتی متاع کو ضائع کرنے سے بچنا چاہیئے۔ اور اظہار کا سلیقہ اپنائے بغیر احساس لٹاتے پھرنا اس کو ضائع کرنے کے مترادف بھی ہے اور اپنی صلاحیت سے چشم پوشی بھی۔
خیر و عافیت کی دعا کے ساتھ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت، طالبہ دعا

صائمہ اسما

عظمیٰ پروین

فضائل قرآن

تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو قرآن کا علم حاصل کریں اور اس کی تعلیم دیں (بخاری)

اللہ تعالیٰ کسی چیز کو اتنی توجہ سے نہیں سنتا جتنی توجہ سے وہ نبی کی آواز کو سنتا ہے جبکہ وہ قرآن خوش آوازی کے ساتھ پڑھ رہا ہو۔ (متفق علیہ)

قرآن کا ماہر قرآن کے لکھنے والے معزز اور پاکیزہ فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور جو شخص قرآنِ مجید کو اٹک اٹک کر اور بڑی مشکل سے پڑھتا ہے اس کیلئے دوہرا اجر ہے (متفق علیہ)

جو شخص دنیا میں قرآن سے شغف رکھتا تھا (قیامت کے روز) اس سے کہا جائے گا کہ قرآن پڑھتا جا اور بلندی کی طرف چڑھتا جا اور اسی رفتار سے ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جس طرح دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا تھا۔ تیری منزل وہ آخری آیت ہوگی جہاں تک تو پڑھتا جائے گا۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد)

کسی حسد یعنی (شک) کی کوئی گنجائش نہیں ہے مگر دو آدمیوں پر ایک وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کا علم دیا ہو اور وہ شب و روز اس کو لئے کھڑا ہو (یعنی نماز میں کھڑا پڑھ رہا ہو یا اس کی تعلیم اور تبلیغ و تلقین میں مصروف ہو) اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو اور وہ شب و روز اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر رہا ہو۔ (متفق علیہ)

تم میں سے کون یہ چاہتا ہے کہ وہ ہر روز بطحان یا عقیق جائے اور وہاں سے بڑے کوہان والی دو اونٹنیاں لے آئے بغیر اس کے کہ اس نے کوئی گناہ یا قطع رحمی کی ہو؟ عرض کیا گیا: ''یا رسولؐ اللہ! ہم میں سے تو ہر شخص یہ چاہتا ہے۔'' فرمایا: ''تم میں سے ایک شخص مسجد میں جائے اور لوگوں کو دو آیتیں پڑھ کر سنائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ اسے روزانہ دو اونٹنیاں میسر آئیں۔ اگر وہ تین آیتیں پڑھ کر سنائے تو یہ تین اونٹنیاں مل جانے سے بہتر ہے۔ اگر چار آیتیں پڑھ کر سنائے تو یہ چار اونٹنیاں مل جانے سے بہتر ہے۔ اسی طرح جتنی آیتیں سنائے وہ اتنی ہی اونٹنیوں سے بہتر ہیں۔ (مسلم)

''کیا تم میں سے کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ جب وہ اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر جائے تو وہ دیکھے کہ اس کے ہاں تین حاملہ بڑی جسیم اور فربہ اونٹنیاں کھڑی ہیں؟'' عرض کیا گیا: ''ہاں یا رسولؐ اللہ ہم یہ چاہتے ہیں۔'' فرمایا: ''تین آیتیں جو تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز میں پڑھے یہ اس کیلئے اس سے زیادہ بہتر ہیں کہ وہ اپنے گھر پر تین ایسی حاملہ، جسیم اور فربہ اونٹنیاں پائے۔'' (مسلم)

جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کرتا ہے قیامت کے روز اس کے والدین کو ایک تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی ایسی ہو گی کہ اگر سورج بھی تمہارے گھروں میں اتر آئے تو وہ اس کی روشنی سے عمدہ ہوگی...... پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ جو شخص خود قرآن کے مطابق عمل کرنے والا ہے اس کی کیا شان ہوگی؟ (احمد، ابوداؤد)

قرآنِ مجید پڑھا کرو کیونکہ وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کیلئے شفیع (سفارش کرنے والا) بن کر آئے گا...... (مسلم)

جو شخص کتاب اللہ کا ایک حرف پڑھتا ہے اس کے بدلے میں اس کی ایک نیکی شمار ہوتی ہے اور ہر نیکی کے بدلے میں دس گنا اجر ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ الم ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ (ترمذی)

جو شخص با آواز بلند قرآن مجید پڑھتا ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو علانیہ صدقہ دیتا ہے اور جو شخص آہستہ آہستہ آواز میں قرآن مجید پڑھتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو چھپا کر صدقہ دیتا ہے۔ (ترمذی،

ابوداؤد)

جس کے سینے میں قرآن نہیں اس کی مثال اجڑے ہوئے گھر کی سی ہے۔(ترمذی)

قرآن کو ذہن میں محفوظ رکھنے اور یادرکھنے کا اہتمام کرو کیونکہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یہ ذہن سے نکلنے کیلئے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ جلدی کرتا ہے جس طرح بندھے ہوئے اونٹ رَسا تڑا کر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔(متفق علیہ)

خبردار!''عنقریب ایک فتنہ برپا ہونے والا ہے۔''

''حضرت علیؓ نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ اس سے بچنے کی کیا صورت ہوگی؟''

فرمایا:''کتاب اللہ......اس میں اس چیز کی خبر بھی ہے کہ تم سے پہلے کی قوموں پر کیا گزری اور اس بات کی خبر بھی ہے کہ تمہارے بعد میں آنے والوں پر کیا گزرے گی اور اس چیز کا ذکر بھی ہے کہ تمہارے معاملات کے درمیان فیصلہ کرنے کی صورت کیا ہے...... یہ قرآن ایک سنجیدہ اور فیصلہ کن کلام ہے، کوئی مذاق کی چیز نہیں ہے...... جو کوئی ظالم و جبار شخص اس قرآن کو چھوڑے گا اللہ تعالیٰ اس کو کچل کر رکھ دے گا اور جو اسے چھوڑ کر کسی اور جگہ سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو گمراہ کر دے گا......اور یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے اور یہ حکیمانہ نصیحت ہے اور یہی سیدھا راستہ ہے یہ قرآن وہ چیز ہے کہ تخیلات اسے غلط راستے پر نہیں لے جاسکتے اور زبانیں اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں کرسکتیں اور علماء کبھی اس سے سیر نہیں ہو سکتے اور خواہ اس کو کتنا ہی پڑھو یہ پرانا نہیں ہوتا اور اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہونگے۔ یہ قرآن ایسی چیز ہے کہ جب جنوں نے اس کو سنا تو وہ کہے بغیر نہ رہ سکے ''ہم نے ایک بڑا ہی عجیب کلام سنا ہے جو راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس لئے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں۔'' جو شخص قرآن کے مطابق بات کرے گا وہ سچی بات کرے گا اور جو اس کے مطابق عمل کرے گا یقیناً اجر پائے گا اور جو اس کے مطابق فیصلہ کرے گا ضرور عدل کا فیصلہ کرے گا اور جو لوگوں کو اس کی پیروی کی دعوت دے گا وہ سیدھے راستے کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرے گا۔(ترمذی)

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو قرآن مجید نے میرا ذکر کرنے اور مجھ سے دعا مانگنے سے روکا اس کو وہ افضل ترین چیز دوں گا جو دعا مانگنے والوں کو دیتا ہوں اس کے بعد رسولؐ اللہ فرماتے ہیں کہ کلام اللہ کی فضیلت باقی کلاموں پر ایسی ہے جیسی اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق پر (ترمذی)

جو صاحبِ ایمان قرآنِ کریم پڑھے اور اس کے مطابق عمل کرے اس کی مثال سنگترے جیسی ہے جس کا ذائقہ اچھا اور خوشبو بھی اچھی ہے۔ جو مومن قرآن کی تلاوت نہ کرے لیکن اس کے مطابق عمل کرے گویا وہ کھجور کی طرح ہے جس کا ذائقہ اچھا لیکن خوشبو نہیں ہوتی۔ منافق (ابوداؤد کی حدیث میں فاجر کا لفظ ہے) جو قرآنِ کریم پڑھتا ہے اس کی مثال گل ریحان جیسی ہے کہ اس کی خوشبو تو اچھی ہوتی ہے لیکن ذائقہ کڑوا ہے اور منافق جو قرآنِ کریم نہیں پڑھتا اس کی مثال اندرائن جیسی ہے جس کا ذائقہ خراب ہوتا ہے اور اس کی بو بھی کڑوی ہوتی ہے۔(بخاری)

قرآن اس وقت تک پڑھو جب تک تمہارا دل اس میں لگا رہے جب دل نہ لگ رہا ہو تو پڑھنا چھوڑ دو۔(متفق علیہ)

وہ شخص ہم میں سے نہیں جو قرآن کو خوش آوازی سے نہ پڑھے یا جو قرآن کو لے کر مستغنی نہ ہوجائے۔(بخاری)

قرآنِ مجید کو اپنی آوازوں سے مزین کرو (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)

اس شخص نے قرآن مجید کو نہیں سمجھا جس نے اسے تین شب وروز سے کم میں پڑھا (ترمذی)

حضرت انسؓ سے نبی ؐکریم کی قرأت کا طریقہ پوچھا گیا انہوں نے فرمایا کہ آپ الفاظ کو کھینچ کھینچ کر پڑھتے تھے۔ مثال کے طور پر انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر بتایا کہ آپ اللہ، رحمٰن اور رحیم کو مد کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔(بخاری)

یہی سوال حضرت ام سلمیٰؓ سے کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ حضورؐ ایک ایک آیت کو الگ الگ پڑھتے اور ہر آیت پر ٹھہرتے جاتے تھے۔

مثلاً الحمدللہ رب العالمین پڑھ کر رک جاتے، الرحمٰن الرحیم پر ٹھہرتے اور اس کے بعد رک کر مالک یوم الدین کہتے۔(مسند احمد، ترمذی)

دوسری روایت میں فرماتی ہیں کہ حضورؐ ایک ایک لفظ کو واضح طور پر پڑھا کرتے تھے۔(ترمذی)

حضرت حذیفہؓ بن یمان بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کی نماز میں حضورؐ کے ساتھ کھڑا ہوگیا تو آپؐ کی قرأت کا یہ انداز دیکھا کہ جہاں تسبیح کا موقع آتا وہاں تسبیح فرماتے، جہاں دعا کا موقع آتا وہاں دعا مانگتے جہاں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا موقع آتا وہاں پناہ مانگتے۔(مسلم، نسائی)

عبداللہؓ بن مسعود بیان کرتے ہیں میں نے ایک شخص کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا اور اس سے پہلے میں نے نبی کریمؐ کو اس سے مختلف طریقے سے پڑھتے سنا تھا۔ میں اسے نبی کریمؐ کی خدمت میں لے آیا اور آپؐ کو اس بات کی خبر دی میں نے محسوس کیا کہ حضورؐ کو یہ بات ناگوار گزری ہے۔ فرمایا: ’’تم دونوں ہی ٹھیک پڑھتے ہو۔ آپس میں اختلاف مت کرو کیونکہ تم سے پہلے جو قومیں ہلاک ہوئیں وہ اختلاف ہی کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔(بخاری)

عنقریب کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو اگرچہ قرآن کو خوب صحت کے ساتھ اس انداز سے پڑھیں گے جیسے تیر کو سیدھا کیا جاتا ہے لیکن اس سے ان کی غرض دنیوی فائدے ہوں گے آخرت ان کا مقصود نہیں ہوگی۔ (ابوداؤد)

جو شخص دنیا میں تعریف و تحسین کیلئے قرآن سیکھتا ہے اور اس کی تلاوت یا تدریس کرتا ہے وہ آگ میں ڈالا جائے گا۔(مسلم)

وہ شخص قرآن پر ایمان نہیں لایا جس نے اس کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کرلیا۔(ترمذی)

میرے بعد میری امت سے وہ قوم ہوگی کہ قرآن پڑھیں گے اور ان کے حلقوں سے نیچے نہ اترے گا دین سے وہ ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکلتا ہے اور پھر نہ آئیں گے وہ دین میں، وہ ساری مخلوق سے بدتر ہیں۔(مسلم)

جو شخص قرآن مجید کو پڑھتا ہے اور پھر اسے بھلا دیتا ہے وہ قیامت کے روز اس حالت میں اٹھے گا کہ اس کا ہاتھ کٹا ہوا ہوگا۔(ابوداؤد)

قرآن کو لے کر (دشمن کی سرزمین میں) نہ جاؤ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائے۔(مسلم)

استفادہ:

فضائل قرآن (سید ابوالاعلیٰ مودودی جمع و تدوین حفیظ الرحمٰن احسن)

تفہیم القرآن

قرآن کا راستہ (خرم مراد)

☆......☆......☆

ڈاکٹر محمد آفتاب خان

قیامِ پاکستان چند تاریخی حقائق

تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ پہلی صدی ہجری ختم ہونے سے قبل اسلام کی رسائی ہندوستان میں ہوگئی تھی۔ محمد بن قاسم نے 93 ہجری مطابق 711ء میں سندھ فتح کرلیا تھا تابعین اسلام کی دولت لیکر سندھ پہنچے تھے۔ قریباً دوصدیوں تک عربوں کی حکومت اس خطے پر رہی مگر بعد میں ختم ہوگئی۔ ہندوستان میں اسلام کا پودا دراصل ترکی النسل غزنوی حکمرانوں نے لگایا۔ ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کے صفحات کچھ یوں لکھے ہیں۔

☆ 1027 میں سلطان محمود غزنوی نے لاہور فتح کیا اور اس کی سلطنت وسیع ہوتی چلی گئی۔ 1193 میں سلطان معز الدین محمد بن سام غوری نے دہلی کو فتح کیا۔ قطب الدین ایبک نے 1206 میں اسلامی حکومت کو بنگالہ تک وسیع کیا۔ خاندان غلاماں کے حکمرانوں نے ہندوستان میں اسلامی حکومت کو وسعت اور ترقی دی۔ خلجی اور تغلق حکمرانوں کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ انہوں نے خطہ زمین ہند کو وحشی تاتاریوں کے حملے سے محفوظ رکھا اور ان کے سامنے سینہ سپر رہے جبکہ اسلامی تہذیب کے مراکز بلخ، بخارا، سمر قند، بغداد اور دمشق میں تاتاریوں کے ہاتھوں تباہی و بربادی کی وہ حکایتِ خونچکاں دہرائی جا رہی تھی کہ چشم فلک نے ایسی تباہی شاید ہی کبھی دیکھی ہو۔

غزنوی سلطنت کے قیام کے بعد لاہور دار الخلافہ بنا اور یہاں اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تہذیب وثقافت کی خوب آبیاری ہوئی۔ اہل علم کی ایک بہت بڑی تعداد وسط ایشیا سے یہاں آ کر آباد ہوئی۔ اہل علم میں سید اسماعیل زنجانی 428ھ اور حسین زنجانی 431ھ نے درس حدیث کا سلسلہ شروع کیا۔

ابوالحسن علی ہجویری (المعروف داتا گنج بخشؒ) نے 465 میں اپنی خانقاہ قائم کی جہاں لوگوں کو تزکیہ نفس کی تربیت اور اسلامی تعلیمات دی جاتی تھیں۔ اس دور میں اہل علم وفضل واعظین، فقہا نے مختلف شعبوں میں کام شروع کر دیا حتیٰ کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ کے خاندان نے دین کی اشاعت اور ترویج کا وہ محیر القول کارنامہ سرانجام دیا کہ تاریخ میں اسکی مثال نہیں ملتی۔ نیز اسی خاندان کے بچوں اور متوسلین نے بعد میں سکھوں اور انگریز کے خلاف علم جہاد بلند کیا جو 1857 اور اس کے بعد تک کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا۔ مسلمان فاتحین جب ہندوستان میں داخل ہوئے اس وقت ہندوستان کی ایک عمومی حالت یہ تھی کہ یہاں بت پرستی اور شرک اپنے عروج پر تھا۔ ہندو ذات پات کے معاملے میں بے حد حساس تھے بلکہ یہ ان کے مذہب کا ایک حصہ تھا۔ ذاتوں کے لحاظ سے پہلے نمبر پر برہمن تھے جن کے ذمہ مذہبی امور کی بجا آوری تھی، دوسرے نمبر پر کھتری جو جنگجو تھے، تیسرے نمبر پر ویش جو کہ کھیتی باڑی کرتے تھے اور چوتھے شودر تھے جن کی حیثیت ہندو معاشرے میں جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ ان کے کوئی حقوق نہ تھے اور یہ درج بالا تین قوموں کے غلام/نوکر پیشہ کے طور پر کام کرتے تھے۔

اگرچہ ہندوستان پر مسلمان بادشاہوں نے قریباً 1000 سال تک حکومت کی لیکن ان میں کسی نے بھی اشاعت اسلام کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی۔ عربوں نے اسلام کی نعمت اہل ایران کو دی اہل ایران نے یہ دولت ماوراالنہر کے ترکوں کو منتقل کی۔ ترک اس نعمت کو لیکر ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اس لیے ہندوستان میں جو اسلام پہنچا تھا وہ تین ہاتھوں کے ذریعے پہنچا تھا اس میں وہ عربی اسلام کی تازگی اور طراوت باقی نہ رہی تھی۔ مختلف اضافوں نے اس کا حلیہ تبدیل کر دیا تھا اور غیر اسلامی احکام اس میں داخل کر دیئے تھے۔

ہندوستان میں ان مسلمان بادشاہوں بالخصوص مغل اور اکبر بادشاہ کے دور میں ہندوؤں کی بہت سی رسمیں محلات اور دربار کی وساطت سے

مسلمان معاشرے میں نفوذ کر گئیں یوں ہندوؤں نے تو چھوت چھات پر یقین رکھنے کے باعث اسلامی تہذیب کو نہ اپنایا تاہم مسلمان ہندو تہذیب اور رسم و رواج سے بہت حد تک متاثر ہوئے۔ اکبر نے اپنی سلطنت کو استحکام دینے کیلئے ایک متحدہ دین اور متحدہ قومیت کی تشکیل کرنی چاہی۔ وہ ہندو مسلم ازدواجی رشتوں کو فروغ دینا چاہتا تھا، خود اس کے حرم میں ہندو راجپوت عورتیں تھیں۔ اگرچہ اکبر کے مرنے کیساتھ ہی اس کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہوسکی تاہم اس کے پوتے داراشکوہ (1658) کے دور میں یہ خیال دوبارہ ابھرا اور اس نے تصوف کے ذریعے ہندومت اور اسلام کا ایک آمیزہ تیار کرنا چاہا۔ اگرچہ اسے اس میں مکمل کامیابی تو نہ ہوئی تاہم تصوف کے نام پر اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کا کام ضرور سرانجام پایا۔ اس تمام صورت حال کے تدراک کیلئے حضرت مجدد الف ثانی سے لیکر شاہ ولی اللہ اور بعد میں کوششیں ہوتی رہیں۔

انگریز کی ہندوستان میں آمد پر ان کے سامنے دو فریق تھے۔ ایک ہندو دوسرے مسلمان۔ مسلمانوں سے چونکہ انہوں نے حکمرانی مکرو فریب کے ذریعے تاجر کا روپ دھار کر حاصل کی تھی اور مسلمان علماء و عوام نے چونکہ ان کے خلاف سخت ردعمل کا مظاہرہ بھی کیا تھا وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے اصل حریف مسلمان ہیں جبکہ ہندوؤں کیساتھ ان کا رویہ مفاہمت کا تھا۔ انہیں بحیثیت قوم انہوں نے ابھارا، ترقی اور فروغ دیا جبکہ مسلمانوں کو گرایا اور ذلیل وخوار کیا۔

چونکہ انگریز تاجر کا روپ دھار کر ہندوستان میں آئے تھے اور یہاں کی زبان، رسم و رواج سے بھی نا آشنا تھے اس لیے انہوں نے ہندو گماشتوں (Agents) پر بھروسہ کیا جو ان کیلئے ہر قسم کی خدمت سرانجام دیتے تھے۔ گویا کہ آغاز کار سے ہی ہندو ان کا فطری حلیف تھا۔ نیز وہ ہندو جو مسلمان بادشاہوں، نوابوں کے ملازم ہوتے تھے وہ انگریزوں کیلئے جاسوسی بھی کیا کرتے تھے۔ بنگال کے نواب سراج الدولہ کا ہندو وزیر امی چند تھا۔ اسی طرح امیران سندھ کا وزیر دیوان آوت رائے تھا۔ ان لوگوں نے ہر دو مسلمان مالکان کے خلاف انگریز کو خفیہ طور پر مدد پہنچائی۔ اس کے علاوہ انگریز نے ہندو عورتوں سے شادیاں کیں اگرچہ وہ ان کی قانونی بیویاں نہ ہوتی تھیں بلکہ ان کی حیثیت داشتہ کی سی ہوتی تھی۔ جب انگریز انگلستان چلے جاتے تو ان کی داشتائیں اور اولاد یہاں ہندوستان ہی میں رہ جاتی تھی جنہیں 40 روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔

انگریز نے اپنی استبدادی حکومت کے استحکام کیلئے ہندوؤں کو خوش کرنے کیلئے بہت سے اقدامات کئے جس سے ہندو عوام اور خواص بہت خوش ہو گئے اور انگریز کے گن گانے لگے۔ ان اقدامات میں ہندو مذہب کے احیاء کیلئے سنسکرت زبان کو فروغ دیا گیا۔ اسی طرح موجودہ ہندی زبان بھی اپنی شکل کیلئے انگریز حکمرانوں کی مرہونِ منت ہے نیز ہندوؤں کو انگریزی تعلیم سے بہرہ مند کرنے کیلئے خصوصی اقدامات کئے گئے۔ ہندوؤں کو سرکاری ملازمتوں میں دل کھول کر حصہ دیا گیا۔ ان پر دولت کی بارش کر دی گئی۔ اس تمام تر تفصیل سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انگریز نے مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی سرپرستی کی جس کے نتیجے میں وہ مسلمانوں سے متنفر ہوتے چلے گئے۔ اگرچہ دلی طور پر تو وہ کبھی بھی مسلمانوں سے خوش نہ تھے تاہم محکوم ہونے کے سبب وہ اپنی طبعی بزدلی اور مکاری سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کے خیرخواہ بنے رہے۔ درج بالا پس منظر میں اب ہم یہ واضح کریں گے کہ ہندوؤں نے انگریز کی اس سرپرستی اور پیٹھ ٹھونکنے کے عمل سے کیا کچھ سیکھا جو مختلف تحریکوں کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔

لارڈ کرزن وائسرائے ہندوستان نے 1905 میں ہندوؤں کو ''چالاک، بزدل اور ڈرپوک'' کہا۔ اس پر ہندو بہت سیخ پا ہوئے اور چونکہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ برطانوی حکومت کے دست و بازو بن چکے تھے اس لیے انہوں نے انگریز کے اس تاثر کو دور کرنے کیلئے مختلف اقدامات کئے جس وجہ سے ہندو قوم پرستی نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ ہندو لیڈروں بالخصوص سر دیال سنگھ دہلوی، دی ساور کرنے جارحیت پسند قوم پرستی کی تلقین کی۔ یاد رہے کہ اس جارح قوم پرستی کا آغاز تو وائسرائے لارڈ کرزن کے جواب میں ہوا تھا اور اسے انگریز کے خلاف ہونا چاہئے تھا لیکن اس جگہ ہندو کی مسلمان دشمنی نے کام دکھایا اور رفتہ رفتہ اس کا رخ مسلمانوں کی طرف ہو گیا۔ اب مسلمانوں کا مذہب، ان کی تہذیب اور ان کی سیاست، سب کچھ زیر عتاب آ گئے۔ اس طرح

ان کے لیڈروں نے مسلمانوں کو جارح اور دشمن قرار دیا۔ نیز

☆ اردو کو ملیچھوں (گندوں) کی زبان قرار دیا

☆ ان متعصب ہندو لیڈران کے نزدیک مسلمان ہندوستان میں ایسے ہیں جیسے جرمنی میں یہودی۔ ان کے ساتھ بھی یہودیوں جیسا سلوک ہونا چاہیے (یعنی انہیں مار دینا چاہیے)

☆ مسلمان اگر یہاں رہنا چاہتے ہیں تو ان کو ہندو بن کر رہنا ہوگا

یہ اور دیگر اس طرح کے بہت سے زہر بھرے کلمات تھے جو دن رات ہندو لیڈر اپنے جلسے جلوسوں میں کہتے پھرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں پر اس کا ردعمل ہوتا تھا اور یوں ہندو مسلم فسادات ہوتے رہے۔ ہندوؤں کے اس رویے سے انگریز بہت خوش ہوئے کہ میثاق لکھنو اور امرتسر کانفرنس کیوجہ سے جو اتفاق و اتحاد کی ایک امید مسلمانوں اور ہندوؤں میں پیدا ہو چلی تھی، وہ انگریز کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔

شدھی کی تحریک:

مسلمانوں کی نا اتفاقی اور کسی موثر تنظیم کے نہ ہونے کیوجہ سے ہندو قوم پرستوں کو ایک اور جارحانہ اقدام کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے مسلمانوں کو ہندو بنانا شروع کر دیا جسے شدھی کی تحریک کہتے ہیں۔ اگر چہ اس کے خلاف مسلمانوں نے کوششیں کیں تاہم ہندو کے خبث باطن کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان بادشاہ کامل 800 سال تک ہندوستان کے حکمران رہے بالخصوص اورنگزیب عالمگیر، جنہیں ہندو اپنا جانی دشمن سمجھتے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کی وگرنہ کسی ایسی کوشش کے نتیجے میں شاید اس وقت تک ایک بھی ہندو ہندوستان میں باقی نہ رہتا۔ ان تمام بادشاہوں بالخصوص اکبر کے زمانے میں تو ہندوؤں کو بہت ہی زیادہ آزادی اور اختیارات دیئے گئے۔

ہندوؤں کو مسلح کرنے اور ہتھیار چلانے کی تربیت دینے کیلئے ڈاکٹر مونجے (ہندو لیڈر) نے 1922 میں سنگھٹن کی تحریک شروع کی جس کے تحت مختلف جگہوں پر اکھاڑے قائم کیے گیے جہاں ہندو نوجوان ہتھیار چلانے کی پریکٹس کرتے تھے اور لاٹھی، خنجر اور چاقو کا استعمال سیکھتے تھے۔ یاد رہے کہ ان کی یہ تیاری اس وقت کیلئے تھی جب انگریز ہندوستان کو آزاد کرتا۔ اس سے بھی ہندو کی مکاری اور منافقت ذہنی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ ٹھیک 25 سال بعد 1947 میں تقسیم ہند کے موقع پر ان ہندو نوجوانوں نے سکھوں کے ساتھ ملکر مسلمانوں کا وہ قتل عام کیا تھا کہ عالم انسانیت نے اس قسم کی وحشت و بربریت کا مظاہرہ تاتاریوں کے علاوہ اور کہیں نہیں دیکھا تھا۔

ہندوؤں کی اس طریق پر تربیت اور تیاری کی وجہ سے ان کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے کہ انہوں نے حضورﷺ کی ذات اقدس کے بارے میں بھی بہت نازیبا باتیں کرنی شروع کر دیں۔ دہلی میں آریہ سماجی لیڈر شردھانند نے حضورﷺ کی شان میں ستاخی کی تو اسے قاضی عبدالرشید نے پستول کی گولی سے ستمبر 1947 کو قتل کر ڈالا اور اقبال جرم کیا اور شہادت کا منصب پایا۔ اس پر گاندھی جیسے لیڈر نے بھی توہین رسالتﷺ کے اس قبیح فعل پر شردھانند کی مذمت نہیں کی بلکہ کہا کہ ”اسلام خوں ریزی کرتا ہے پہلے بھی کی ہے اور اب بھی کرتا ہے“...... اس کا جواب دینے کیلئے سید مولانا ابو الاعلی مودودی نے ایک کتاب الجہاد فی الاسلام لکھی جس کی علامہ اقبال نے بہت تحسین کی۔

اس طرح کے واقعات ہندوستان کے مختلف شہروں میں کئے گئے جس پر فرزندان توحید نے اپنی جانیں قربان کرتے ہوئے ان گستاخان رسولﷺ کو جہنم رسید کر دیا۔ اس موقع پر مولانا ظفر علی خان نے بہت مشہور رباعی کہی:

نماز اچھی، زکوٰۃ اچھی ہے، حج اچھا، جہاد اچھا
مگر میں باوجود اس کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجہِ یثرب کی حرمت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

متحدہ قومیت اور ہندو:

ہندوؤں کے اس رویے کے پس پشت انگریز کی مسلمان دشمنی بھی کام کر رہی تھی کیونکہ انگریز نہیں چاہتا تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں

Found

اتفاق ہو جو اس کی سلطنت کیلئے خطرے کا باعث تھا۔ اس لیے اس نے کچھ آریہ سماجی لیڈروں کو در پردہ شہ دی۔ وہ لیڈر خود بھی مسلمانوں کے خلاف تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے خلاف۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو سیاست سے بے دخل کرنے کیلئے اس قسم کے فسادات شروع کرائے۔ ہندو اور انگریز کی اسی ملی بھگت کے نتیجے میں پشاور کے قصہ خوانی بازار میں مسلمانوں کے جلوس پر گولی چلا کر سینکڑوں کو شہید کر دیا گیا اور سینکڑوں افراد زخمی ہوئے۔ اس دوران پٹھانوں کے عظیم مذہبی راہنما مفتی سرحد حاجی عبدالرحیم پوپلزئی بھی شہید ہوئے۔ اس کے علاوہ بھی ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کو ہمیشہ ہندوؤں نے انگریز حکمرانوں کی شہ پر سبوتاژ کیا۔ کانگریس نے بھی ہندو انتہا پسندوں کی ہمنوائی کرتے ہوئے جداگانہ انتخاب کا جو اصول میثاق لکھنو 1916 میں طے ہوا تھا اسکی مخالفت شروع کر دی۔ اسی طرح نہرو رپورٹ میں جداگانہ انتخاب کا حق مسلمانوں سے واپس لے لیا گیا۔ اس رپورٹ کو کانگریس نے قبول کر لیا کیونکہ یہ مسلمانوں کو ہندو کا غلام بنانے کی ایک سازش تھی۔ اس پر محمد علی جناح نے برطانیہ میں نومبر 1930 کو لندن میں گول میز کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس میں مولانا محمد علی جو شدید بیمار تھے بیماری کی حالت میں لندن جا کر شریک کانفرنس ہوئے اور انہوں نے یہ تاریخی یادداشت (Memorandum) انگلستان کے وزیراعظم کو دی۔

"کسی بھی دوسرے ہندوستانی سے زیادہ میں اس بات کا خواہشمند ہوں کہ غیر ملکی اقتدار ختم ہو لیکن یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ غیر ملکی دکانداروں کی بجائے اپنے ملک کے دکانداروں کے ایک فرقے کو اپنی قسمتوں کا مالک بنا دیا جائے"۔

اس کانفرنس میں اگرچہ ہندو مہاسبھا کے ممبروں نے بہت مخالفت کی لیکن وزیراعظم برطانیہ ریمزے میگڈانلڈ نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دیگر پسماندہ اقوام اچھوت اور سکھوں کو بھی جداگانہ انتخاب کا حق دیدیا۔ اس طرح نہ صرف مسلمانوں کا حق برقرار رہا بلکہ ان کی وجہ سے دوسری اقوام کو بھی یہ حق مل گیا لیکن سکھوں نے یہ حق واپس کر دیا جس کی سزا وہ آج تک بھگت رہے ہیں۔

اسی طرح اچھوتوں کو بھی اپنے ساتھ ملانے کے لئے گاندھی نے اپنی چالاکی اور مکاری سے مرن برت رکھا کہ اگر اچھوتوں نے جداگانہ انتخاب کا حق استعمال کیا تو وہ مر جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ گاندھی جیسا چالاک آدمی اچھوتوں کی ایک عظیم اکثریت کو ہندو اقتدار کے حصول کیلئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام ہندو قوم کی طرف سے ڈاکٹر امبید کر پر دباؤ پڑنا شروع ہوا کہ "باپو" کی زندگی بچانے کیلئے وہ یہ قربانی دیں کہ سکھوں کی طرح اس حق کو استعمال نہ کریں۔ وہ اس دباؤ کے آگے نہ ٹھہر سکا اور گاندھی اور امبید کر کے درمیان معاہدہ پونا ہوا جس کے تحت اچھوتوں نے اپنے لیے ہندوؤں کیساتھ مخلوط طریقہ انتخاب کو ہی برقرار رکھا۔ اس طرح ایک زریں موقع جس سے سکھ اور اچھوت بہت زیادہ فوائد حاصل کر سکتے تھے کھو دیا اور آج بھی وہ ہندوستان میں ایک تیسرے درجے کے شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ یاد رہے کہ ہندو، اچھوتوں کو اس قدر ذلیل اور ناپاک سمجھتے ہیں کہ اگر کسی برہمن سے ان کا جسم چھو بھی جائے تو وہ گنگا کے پانی سے نہانا ضروری سمجھتا ہے اور اس اچھوت کو سزا دی جا سکتی ہے نیز اس تفصیل کے لکھنے کی ضرورت اس لیے بھی محسوس ہوئی ہے کہ پاکستان کے دستور میں بھی عیسائیوں اور ہندوؤں کیلئے جداگانہ طریقہ انتخاب کی شق موجود ہے جسے چند ناعاقبت اندیش اپنے مفاد کی خاطر ختم کرانا چاہتے ہیں تاکہ بعد میں وہ ان لوگوں کو رشوت دیکر اسمبلیوں میں اپنے ووٹ بنک کو بڑھا سکیں قطع نظر اس کے کہ اگر یہی طریقہ انتخاب ہم نے پاکستان میں بھی لاگو کرنا تھا تو آج سے 100 سال قبل ہمارا ہندو سے اختلاف کس بات پر تھا؟ گاندھی اور نہرو بھی تو قائداعظم کو مخلوط طریق انتخاب کی دعوت پر بہت سے حقوق مسلمانوں کو دینے کیلئے تیار تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ صوبہ سرحد کی نیشنل عوامی پارٹی، اپنی اس سیاسی شکست کا بدلہ لینا چاہتی ہے جب ڈاکٹر خان کی وزارت میں اس صوبہ میں ریفرنڈم ہوا تھا اور مسلمانان سرحد نے اپنا ووٹ پاکستان کے حق میں استعمال کر کے قائداعظم کی اپیل کو کامیاب کیا تھا اور جس کی وجہ سے عبدالغفار خان اور ڈاکٹر خان کو کانگریس کی ہائی کمان سے ڈانٹ کھانی پڑی تھی کہ کانگریس نے اس مقصد کیلئے جو خطیر رقم انہیں مسلمانوں میں

بانٹنے کیلئے دی تھی وہ کہاں گئی؟ ہندوستان میں مسلمانوں کے حالات اسی طرح خراب سے خراب تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ مسلمانوں میں کوئی قدآور شخصیت موجود نہ تھی کیوں کہ محمد علی جناح، ہندو قوم کی بے ایمانی اور انگریز کی ملی بھگت سے دلبرداشتہ ہو کر انگلینڈ چلے گئے تھے اور وہاں وکالت شروع کردی تھی۔

یہی وہ ایام تھے جب اللہ کریم نے مسلمانان ہند کو اپنی غیبی امداد سے نوازا علامہ اقبال کی درخواست پر محمد علی جناح ہندوستان واپس آئے اور مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی۔ جب محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی تو ہندوستان میں مسلمان مختلف پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ بنگال میں فضل الحق کی سرامک پارٹی تھی' پنجاب میں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی تھی۔ سرحد میں عبدالغفار خان کے خدائی خدمت گار تھے۔ محمد علی جناح کے پیش نظر سب سے بڑا کام مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا تھا۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے ملک بھر کے دورے کرنے شروع کئے اور مسلمانان ہند تک اپنا پیغام پہنچانا شروع کیا۔

اس دوران نئے دستور کے تحت ملک میں الیکشن آ گئے۔ اس الیکشن میں مسلم لیگ کو زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تاہم کانگریس کو بھی بہت سے مسلمانوں کی حمایت حاصل نہ ہو سکی اور یوں اس کے اس کے دعویٰ کا پول کھل گیا کہ وہ ہندوستان کے تمام باشندوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ نہرو کے اس دعویٰ کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں ایک کانگریس اور دوسری حکومت برطانیہ..... محمد علی جناح نے جواب دیا کہ ''نہیں تیسری پارٹی بھی ہے اور وہ مسلمان ہیں، مسلم لیگ ہے'' 1937 کے انتخاب میں صوبوں میں کانگریس کو واضح اکثریت حاصل ہوئی اور انہوں نے ہندوستان کے بڑے صوبوں میں اپنی حکومت بنالی جس میں کسی دوسری جماعت یا مسلمان کو شریک نہ کیا۔ اگرچہ مسلم لیگ حزب مخالف بن گئی لیکن مشیت ایزدی کو اسی شر سے مسلمانان ہند کیلئے خیر کا پہلو نکالنا مقصود تھا۔ آیئے دیکھیں کہ اس شر انگیزی سے خیر کے کیا کیا پہلو پردہ غیب سے ظہور میں آتے ہیں۔

☆ صوبوں میں کانگریسی حکومت کیا قائم ہوئی، کانگریس کو اپنی من مانی کاروائیاں کرنے کیلئے گویا، ایک پلیٹ فارم میسر آ گیا۔ ان کے قومی ایجنڈے میں اولین بات یہ شامل تھی (اور اب بھی ہے) کہ مسلمانان ہند کو بھی کسی طرح ایک ''متحدہ ہندوستانی قوم'' کے دھارے میں شامل کرلیا جائے۔ ان کے خیال کے مطابق ہندوستان میں رہنے والے تمام لوگ ایک قوم تھے جن کی تشکیل میں مذہب کو کوئی دخل حاصل نہیں ہونا چاہیے۔ ان کے اس مؤقف کے پیچھے بہت گہرا اور سوچا سمجھا منصوبہ یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو اس دام فریب میں لاکر ایک دفعہ انگریز کی غلامی سے نکل کر ہندوستان پر حکومت قائم کرلی جائے۔ پھر اپنی عددی اکثریت کی بنا پر مسلمانوں کو اپنا مذہب، دین، تہذیب اور علیحدہ تشخص تبدیل کرنے کیلئے حکومت کے تمام ذرائع و وسائل سے بتدریج کام لیتے ہوئے کوشش کی جائے۔ انہیں یہ یقین تھا کہ جس طرح انگریز نے اپنے تعلیمی نظام اور انتظامی اختیارات سے مسلمانوں کے خوشحال طبقے کی نوجوان نسل کو گمراہ کر دیا تھا اور اگرچہ وہ کافر تو نہ بن سکے تاہم مخلص مسلمان بھی نہ رہے تھے اسی طرح وہ بھی 4/3 صدیوں میں مسلمان نامی قوم کو اپنے اندر ضم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مسلمانان ہند کی یہ خوش قسمتی تھی کہ عین اس وقت تین ایسے اعاظم رجال پیدا ہوئے جنہوں نے ہندو اور انگریز کی اس سازش کو کامیاب نہ ہونے دیا اور ہندوؤں کے ان مزعومہ خیالات و افکار کا تاروپود اس معقول طریق پر بکھیر کر رکھ دیا کہ ان کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔

ہندو اور انگریز کے متحدہ وطنیت کے فتنے نیز دیگر اہم ترین مسائل و موضوعات کے بارے میں ان تین اہل علم و دانش کے مؤقف میں بے حد ہم آہنگی پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے تصور پاکستان کو عملی شکل ملی اور تشکیل وطن کے بعد ساتھ ہی ساتھ اس کی فکری اور نظریاتی بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط ترین بنانے کے کام کا آغاز ہوا۔ یہ تین عظیم افراد محمد علی جناح، علامہ محمد اقبال اور سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔

اس جگہ اس امر کا تذکرہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ انگریز اور ہندو کی مکارانہ چال یعنی متحدہ قومیت کے نعرہ کو مسلمانان ہند کے ایک بہت اہم مذہبی مکتب فکر سے بھی تائید حاصل ہوئی۔ یہ علم و تقویٰ کے ایسے

وارثین تھے جنھوں نے مسلسل دوصدیوں سے زائد عرصے تک انگریزی استبداد اور تسلط کے خلاف جہاد کیا تھا۔ علماء کے اس گروہ کا تو وظیفہ حیات ہی تشبہ بالکفار کے خلاف تبلیغ کرنا تھا اور جو انگریزی جوتا اور انگریزی لباس پہننے کو بھی ناجائز قرار دیتے تھے لیکن اس مسئلے پر ان سے جو سہو ہوا اس کا خمیازہ ملت اسلامیہ آج تک بھگت رہی ہے۔

متحدہ قومیت اور مسلمان:

جیسا کہ درج بالا سطور میں اشارہ کیا گیا کہ انگریز اور ہندو کے متحدہ قومیت کے نعرے کو عملی شکل دینے کے مختلف اقدامات کانگریس کی حکومتوں نے فوری طور پر شروع کئے۔ اس نعرے کو علماء کے ایک حلقے سے بھی پذیرائی حاصل ہوئی۔ مدرسہ دیوبند مسلمانان ہند کی نظر میں ایک ایسا معتمد دینی مدرسے کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا جس کی پشت پر علماء و اتقیاء کا ایک سلسلۃ الذہب تھا جنہوں نے اپنے خون سے آزادی کے پودے کی آبیاری مسلسل دوصدیوں سے بھی زائد عرصے سے کی تھی۔ اس مدرسے کے صدر مدرس حضرت مولانا حسین احمد مدنی ؒ نے مسجد کے منبر پر بیٹھ کر تقریر میں کہا کہ ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں''...... اس ایک جملے کا مقصد یہ تھا کہ قوموں کی تشکیل میں مذہبی تعلیمات اور احکامات کو کوئی دخل حاصل نہیں ہوتا بلکہ کسی ایک خطہ زمین میں رہنے والے تمام لوگ ایک قوم ہوتے ہیں اور یہی وہ بات تھی جو کانگریس، ہندو اور انگریز اس ملک کے مسلمانوں کو نہ صرف باور کرانا چاہتے تھے بلکہ اس کے تحت ہندوستان کو آزاد کر کے اس میں ''ہندوستانی قوم'' کی بالادستی قائم کرنا چاہتے تھے۔ صورت حال گویا یوں بن گئی کہ صنم خانے کو کعبے سے پاسبان مل گئے۔

اس پر سب سے پہلا ردعمل علامہ اقبال کی جانب سے اشعار کی صورت میں آیا۔

چونکہ یہ اشعار فارسی میں تھے اس لیے عام دیوبندی حضرات اور مولوی صاحبان کو اس میں جس طرح دار انداز میں تنقید کی گئی ہے اس کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ نہ ہو سکا یا کہہ لیجئے کہ اسے ہضم کر لیا گیا لیکن انہی دنوں میں جب مولانا مودودی نے اپنی کتاب ''مسلمان اور سیاسی کشمکش'' لکھی اور اس میں قرآن وحدیث اور فقہی کتب سے یہ واضح کیا گیا کہ مولانا مدنیؒ کا مؤقف مبنی برصحت نہیں اور اسلام کی تعلیمات کے منافی ہے کہ حبش کے بلالؓ کو تو حضرت عمرؓ جیسا جلیل القدر صحابی اور خلیفہ رسول ﷺ ''سیدنا بلال'' کہے اور ابوجہل اور ابولہب (جو حضور ﷺ کے چچا تھے) کو ہم جیسا عامی آدمی بھی ملعون اور کافر کہتا ہے۔ اس سے بڑھ کر وطن کی نفی اور کس چیز سے ہو سکتی ہے؟ اس طرح مولانا مودودی نے جب اس کتاب کا دوسرا حصہ ''مسلمان اور سیاسی کشمکش (حصہ دوم)'' لکھا اور اس میں یہ واضح کیا کہ مسلم لیگ میں شامل بیشتر افراد جن کی اپنی زندگی میں اسلام کی کوئی رمق تک موجود نہیں وہ کیسے ایک اسلامی مملکت کا کاروبار اسلامی اصولوں پر چلا سکیں گے اور جنہیں حضرت قائداعظم نے خود بھی ''کھوٹے سکے'' کہا تھا۔ مزید برآں اسی سلسلے کی تیسری کتاب میں مولانا مودودی نے اسلامی حکومت کے خدوخال اور ہندوستان کی تقسیم کیلئے تجویز دی تھی۔ حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کر دیوبند اور اس فکر کی حامل سیاسی لیڈر شپ نے ابھی تک مولانا مودودی کے اس جرم کو معاف نہیں کیا اور اسی طرح مسلم لیگ کے بھی چند ایسے بہی خواہ ہیں جنہیں بھی ان ''کھوٹے سکوں'' پر تنقید ابھی تک نہیں بھولی اور وہ اپنے مقالوں اور اخبار میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کو مطعون کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ تاہم یہ مشیتِ ایزدی کا خصوصی کرم تھا کہ اس دور میں ہندوستان میں تین ایسی شخصیات اوپر تلے پیدا ہوئیں جن کے فکر وعمل اور سوچ میں حیرت انگیز موافقت، یکسانیت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے جس کے نتیجے میں تصور سے لیکر ملک کی تشکیل اور اس کے بعد پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کیلئے مسلمانان ہند کی ایک ایسی جماعت برپا ہوئی جس نے پاکستان کو کفر و الحاد کی گود میں جانے سے بچانے کیلئے جان و مال کی کسی قسم کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کیا۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے یہ بتایا تھا کہ 1937 کے انتخاب میں کانگریس کو سات صوبوں میں اکثریت حاصل ہوئی تھی جس پر انہوں نے وہاں حکومت سازی میں کسی مسلمان کو شامل نہیں کیا اور اپنی عددی اکثریت کی بنا پر ایسے اقدامات کرنے شروع کئے جس کے نتیجے میں

مسلمان عوام اور خواص سب کی آنکھیں کھل گئیں اور اگرچہ ہندو اور انگریز کی چال تو یہ تھی کہ اسطرح مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے ہندوؤں کا غلام بنا دیں لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

الیکشن میں جیتنے اور مختلف صوبوں میں اپنی حکومتوں کے قیام کے فوراً بعد کانگرس نے فوری طور پر چند ایسے اقدامات شروع کئے جو ان کے اصل مقاصد (متحدہ قومیت کو پروان چڑھانا اور مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کا خاتمہ کرنا) کے حصول کیلئے ضروری تھے۔ ان میں واردھا سکیم، ودیا مندر سکیم، ہندو دھرم کا فروغ، مسلمانوں کے اعتقادات اور ناموسِ رسالت پر حملے شامل ہیں۔

ادھر ہندوستان میں یہ حالات ہو رہے تھے کہ ستمبر 1939 میں برطانیہ جنگ عظیم میں شامل ہو گیا۔ اس مشکل وقت میں انگریزی حکومت کی خواہش تھی کہ ہندوستان اس جنگ میں برطانیہ کا ساتھ دے۔ کانگریس نے اس موقع پر انگریز کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا و راس طرح ہندوستان پر جنگ مسلط کرنے کی مخالفت کی اور اکتوبر 1939 میں تمام کانگریس حکومتوں نے استعفیٰ دیدیا...... یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوؤں نے اپنے فطری حلیف سے نہ صرف اختلاف کیا تھا جس سے انگریز کو ہندو کا گھناؤنا چہرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ اگرچہ ایسا کانگریس نے اپنی پالیسی کے تحت کیا تھا کہ اس طرح وہ انگریز کو اپنی شرائط پر ہندوستان کو جلد آزادی دینے پر مجبور کر دیں گے تاکہ وہ مسلمانوں کو اپنا غلام بنا سکیں لیکن اس سے ہندو بنئے کی نفسیات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بھیڑیئے کے روپ میں وہ کسی موقع کی تلاش میں رہتا ہے اور موقع ملنے پر وار کرنے سے کبھی نہیں چوکتا!......'' تاہم قائداعظم کی فراست کی وجہ سے مسلم لیگ نے اس موقع پر وائسرائے سے نرم گفتگو کی اور شرکت کیلئے چار شرائط پیش کر دیں نیز مسلم لیگ کی وزارتوں نے استعفیٰ بھی نہیں دیا۔ جونہی کانگریس کی وزارتیں ختم ہوئیں قائد کی فراست نے فوراً ہی 22 دسمبر 1939 بروز جمعہ سارے ہندوستان میں یوم نجات منانے کی اپیل کر دی۔ اسطرح کانگریس ذلیل وخوار ہو کر رہ گئی اور مسلم لیگ کا وقار عوام الناس جس میں بہت سے ہندو، پارسی، اچھوت سب شامل تھے، انہوں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ یہ دن منایا۔ اس اقدام سے کانگریس کو جو تکلیف پہنچی اس کا اظہار ایک انگریز صحافی آرتھر مور کے اس تبصرے سے با آسانی کیا جا سکتا ہے کہ ''وہ زخمی سور کی طرح مضطربانہ حرکتیں کرنے لگی'' کانگریس کے اس دوسالہ دور کی کارکردگی کے نمایاں ترین خدوخال، جن سے مسلمانانِ ہند نے یہ سبق حاصل کیا کہ مسلم لیگ کے وہ تمام اندیشے اور خطرات درست تھے جو وہ کانگریس کے اقتدار میں آنے کے بارے میں کیا کرتے تھے اس سے یہ واضح ہو گیا کہ:

☆ مسلمانوں کے مذہب میں مداخلت کی گئی

☆ ان پر بت پرستی اور دیگر مشرکانہ امور میں شرکت لازمی قرار دی گئی۔

☆ ان کیلئے ایسا لادینی نظام تعلیم مسلط کیا گیا جس سے ان کا منفرد دینی اور تہذیبی تشخص ختم ہو جاتا۔

☆ اس تمام دور میں مسلمانوں کو قتل وغارت کا نشانہ بنایا گیا اور یوں ان کے جان، مال، عزت وآبرو کو بھی تحفظ نہ ملا۔

ان تمام امور نے نہ صرف مسلمانانِ ہند کی آنکھیں کھول دیں بلکہ دیگر اقلیتوں کو بھی پتہ چل گیا کہ سوراج (ہندوستان کی آزادی) اپنے جلو میں کیا تحفے لیکر آئیگی اگر اقتدار صرف ہندو کے ہاتھ میں دیا۔ ہندوؤں کے اس منافقانہ رویے سے انگریز کو بھی پتہ چل گیا کہ ان کے برے وقت میں ان کے ''آشنا'' نے ان کیساتھ کیسا سلوک کیا اور یہ کہ مسلم لیگ کے وہ خدشات غلط نہیں جو وہ ہندوؤں اور کانگریس کے بارے میں کرتے رہتے ہیں کہ انکا مقصد ہندوستان میں ہندوؤں کی حکومت قائم کرنا ہے۔

اس تمام تر صورت کے علی الرغم سیاسی طور پر قائداعظم نے چند شرائط پر کانگریس حکومت کے ساتھ تعاون کی پیش کش کی جسے گاندھی نے تسلیم نہیں کیا کہ کانگریس اور ہندو جاتی ابھی تک اپنی وزارتوں کے ختم ہونے پر زخموں سے بہتے ہوئے خون کو چاٹ رہی تھی اور بقول انگریز صحافی ''زخمی سور کی طرح مضطرب تھی'' اور اپنے ان تمام تر حالات کا سب سے بڑا فائدہ مسلم لیگ کو ہوا کہ مسلمانانِ ہند کا اس پر اعتماد بڑھ گیا۔ گویا پاکستان کی تشکیل کے لئے جس سٹیج کی ضرورت تھی وہ اب قضاو قدر کی جانب سے بچھائی جا رہی تھی۔ انسانی زندگی، انفرادی یا اجتماعی میں کامیابی کیلئے کسی واضح مقصد اور نصب العین کا ہونا ایک بہت ضروری امر ہوا کرتا ہے کہ یقینی مقصد کے بغیر انسان کسی جانب درست انداز میں پیش رفت نہیں کر سکتا۔ مقصد اور نصب العین کا تعین ہو جانے پر انسان کی

تمام تر خفتہ صلاحیتوں کو جلا مل جاتی ہے اور وہ اپنی منزل کی جانب بہت تیزی کیساتھ رواں دواں ہو جاتا ہے۔

ایک ایسے وقت میں جبکہ مسلمانان ہند کے ساتھ ساتھ، انگریز بھی اس بات کا قائل ہو گیا کہ مسلمان اور ہندو ایک ملک میں اکٹھے نہیں رہ سکتے تو پھر وہ بھی اس ''دھرتی ماتا'' کو تقسیم کرنے کا قائل ہو گیا۔ لیکن اس جگہ مسلمانان ہند کو جس چیز کی کمی بہت بری طرح سے محسوس ہو رہی تھی وہ کسی ایسی شخصیت کی تھی جو انہیں منزل مقصود تک پہنچانے میں ان کی راہنمائی کرتی۔ حصول آزادی کی جدو جہد انسانی تاریخ میں کبھی بھی خاک و خون کے دریا عبور کیے بغیر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی۔ اس کٹھن اور دشوار مسافت کو طے کرنے کے لئے ایک دانا و بینا راہبر و راہنما کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ مسلمانان ہند کی بدقسمتی کہ عین انہیں دنوں 1931 میں مولانا محمد علی جوہر انتقال کر گئے اور ان کے سات سال بعد 1938 میں علامہ اقبال کا انتقال بھی ہو گیا اور یوں مسلمان دو ایسے راہنماؤں سے محروم ہو گئے جنہوں نے عملی اور فکری طور پر مسلمانوں کی کشتی کو طوفانوں کے بھنور سے نکالا تھا۔ اسی طرح ایک دوسرا بہت بڑا دھچکہ مسلمانوں کو اس وقت لگا جب مولانا ابوالکلام آزاد جنہیں ان کی تبحر علمی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے داعی کی بناء پر امام الہند کہا جاتا تھا وہ بھی کانگریس کے ہمنوا بن کر متحدہ قومیت کے داعی اور مبلغ بن گئے---

تاریخی طور پر یہ تین ایسے بڑے حادثات تھے کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب مسلمانوں کی وہ ناؤ جسے بہت مشکل دور سے نکالا گیا تھا کہیں ڈوب ہی نہ جائے اس وقت مسلمانان ہند بہت ہی گھمبیر حالات میں گھرے ہوئے تھے۔ کوئی ایسی قیادت نہ تھی جو مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ان کی راہنمائی کرتی اس وقت مسلمان بہت سی جماعتوں میں تقسیم تھے۔ ان میں کانگریس کا ذہن رکھنے والے مسلمان جو اکثر دیو بند اور مولانا آزاد کے زیر اثر تھے 'جمعیت العلماء ہند' مومن کانفرنس' خاکسار اور خدائی خدمت گار وغیرہ اہم ترین ہیں جو اپنے اپنے طور پر کسی متفقہ منزل کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ غرض یہ ایسی پراگندہ خیالی اور خلط مبحث کا دور تھا جس کی الجھنوں سے آخر وقت تک مسلمان اصولی حیثیت سے یہ طے نہ کر سکے کہ ہم فی الواقع ہیں کیا اور ہمیں اس سرزمین میں اپنی کس جنت کو قائم کرنے کیلئے مجاہدہ کرنا چاہئے۔

محمد علی جناح 1907ء میں دادا بھائی نوروز جی کے کہنے پر کانگریس میں شامل ہوئے تھے اور ان کی حیثیت ایک قومی راہنما کی تھی اور وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست داعی تھے 1913 میں وہ مسلم لیگ میں شامل ہوئے مگر اب بھی ہندو مسلم اتحاد کیلئے کوشاں رہے۔ تحریک خلافت کے بعد جو فسادات ہندوستان میں ہوئے اور خاص طور پر ہندوؤں نے اہانت رسول ﷺ کی جو مذموم مہم چلائی تھی' وہ اس سے دل برداشتہ ہو گئے۔ نہرو رپورٹ، ہندو مسلم تعلقات کو خراب کرنے میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ دسمبر 1920ء میں آل پارٹیز کانفرنس کلکتہ میں انہوں نے شرکت کی اور اپنی جانب سے حالات کو بہتر بنانے کیلئے چودہ نکات پیش کیے جنہیں ہندو انتہا پسندوں نے نہ صرف رد کر دیا بلکہ ان کی ذات پر بھی طعن و تشنیع سے حملے کیے گئے۔ ان وجوہات سے ان کا دل ہندوؤں کی طرف سے بیزار ہو گیا اور دوسرے دن جب وہ واپس ہوئے تو جمشید جی نوشیرواں جی ان کو چھوڑنے کیلئے سٹیشن پر آئے۔ ان کا بیان ہے کہ قائداعظم نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ اب جدائی کا آغاز ہے۔ یہ کہہ کر ان کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ مسلمانان ہند کی تاریخ میں 1929 سے 1934 تک کا دور تاریک ترین دور ہے۔ مولانا محمد علی کا انتقال ہو گیا تھا۔ قائداعظم لندن جا کر مقیم ہو گئے تھے ادھر 1930 میں مسلم لیگ کا اجلاس علامہ اقبال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس کے بعد 1931 اور 1932 میں بھی اجلاس ہوئے لیکن مسلم لیگ میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی ان حالات میں 1934 میں علامہ اقبال نے قائداعظم کو واپس ہندوستان آ کر مسلمانان ہند کی قیادت کرنے پر مجبور کیا اور بالآخر لیاقت علی خان لندن گئے اور وہ ان کو لیکر واپس آئے۔

مارچ 1934 میں انہوں نے مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں طلب کیا اور دونوں گروپوں کو متحد کیا۔ وہ مسلم لیگ کے متفقہ صدر بنے۔ پھر 13 سال تک صدر منتخب ہوتے رہے۔ ان کی قیادت میں مسلم لیگ نے ایک عوامی جماعت کی حیثیت اختیار کی۔ ادھر برطانیہ نے جنگ تو جیت لی

لیکن اس جنگ کی وجہ سے وہ بالکل کھوکھلا ہوکر رہ گیا تھا اور اس قابل نہ رہا کہ ہندوستان پر اپنے قبضے کو مزید طوالت دے سکے۔ اس تمام دوران میں قائداعظم کی راہنمائی میں مسلم لیگ نے پاکستان کے مطالبے سے کم کسی چیز پر اتفاق نہ کیا اس لیے برطانوی حکومت کو ان کے سامنے جھکنا پڑا۔

قرارداد پاکستان 1940 کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس میں وہ قرارداد پاس ہوئی جسے قرار داد پاکستان کہتے ہیں۔ اس تاریخی قرارداد کے الفاظ ہماری نوجوان نسل کو ذہنوں میں ہمیشہ تازہ رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ قرارداد دراصل لاکھوں شہداء اور ماؤں، بہنوں کی قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہوئی جنھوں نے اپنی جان، مال، اور سب کچھ انگریز اور بعد میں انگریز و ہندو گٹھ جوڑ کے خلاف لڑنے میں لگادیا۔ قرارداد کے الفاظ ہیں

☆ ''آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ جب تک دستوری منصوبے میں درج ذیل بنیادی اصول شامل نہ کیے جائیں اور اس پر ملک میں عمل درآمد نہیں کیا جائے، اس وقت تک وہ مسلمانوں کیلئے قابل قبول نہیں ہوگا''۔

☆ ''جغرافیائی اعتبار سے متصل اور ملحق یونٹوں پر مشتمل علاقوں کی حد بندی کی جائے اور ضروری علاقائی ردو بدل کیا جائے''۔

☆ ''یہ کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی جن علاقوں میں تعداد کے لحاظ سے مسلمان اکثریت میں ہیں انہیں خودمختار ریاست قرار دیا جائے جس میں شامل یونٹ خودمختار اور آزاد قرار پائیں گے۔ یہ کہ ان یونٹوں کی اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق اور مفادات کے تحفظ کیلئے ان کے صلاح ومشورے سے دستور میں مناسب، موثر اور واضح انتظامات رکھے جائیں اور ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں دیگر اقلیتوں کے صلاح مشورے سے ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی اور دیگر حقوق و مفادات کے تحفظ کی حمایت کی جائے۔''

اس قرارداد کو فضل الحق، وزیراعلیٰ بنگال نے پیش کیا اور تمام صوبوں نے اس کی تائید کی۔ اسی قرارداد کے پاس ہونے پر قائداعظم نے اپنے سیکرٹری مطلوب الحسن سید سے کہا کہ آج اگر اقبال زندہ ہوتے تو وہ خوش ہوتے ہم نے ان کی خواہش پوری کردی۔

قرارداد لاہور کی مخالفت میں ہندو لیڈر اور کانگریس پیش پیش تھے لیکن ان کے جلو میں راہ نمایانِ دین اور مفتیان کرام کی بھی ایک متعدبہ تعداد شامل تھی۔ ان میں کانگرسی ذہن رکھنے والے مسلمان، جمعیت العلماء ہند، مومن کانفرنس، خاکسار، خدائی خدمت گار اس قرارداد کی مخالفت میں ایک زبان تھے۔

اس جگہ اس تاریخی واقعہ کا تحریر کرنا بھی شاید ضروری ہو کہ کانگریس وزارتوں کے استعفیٰ کے بعد، ہندوستان کی اقلیتوں اور بعض عناصر نے کانگریس کا یہ دعویٰ کہ وہ باشندگان ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے ماننے سے انکار کردیا۔ ان میں سے ساورکر (مہاسبھا)، ڈاکٹر امبید کار (اچھوت) سرچمنلال ستیل داد (لبرل پارٹی) کاؤس جی جہانگیر (پارسی) شامل تھے۔ ان سب نے مل کر وائسرائے کو ایک یادداشت پیش کی کہ اب کانگریس ہماری نمائندہ جماعت نہیں ہے۔ یہ کانگریس کے منہ پر ایک زبردست تھپڑ تھا جس سے اس کے اس دعویٰ کی قلعی کھل گئی کہ وہ عوام کی نمائندگی کی واحد ٹھیکیدار ہے اور یوں انگریز پر بھی یہ حقیقت کھل گئی۔ اسی سے تقویت پاکر انگریزی حکومت نے کانگریس وزارتوں کے خلاف قرطاس ابیض شائع کردیا۔ اس طرح جہاں عوام کے سامنے بہت سے حقائق آ گئے بلکہ پیرپور رپورٹ جسے انگریزی وائسرائے نے درخور اعتنا نہ سمجھا تھا، اس کی بھی تائید ہوگئی۔

انہیں دنوں جنگ عظیم کے نتیجے میں جاپانی فوجیں ہندوستانی میں آسام تک گھس آئیں۔ کانگریس جو پہلے ہی اپنی شکست سے جھلائی ہوئی تھی (بقول انگریز صحافی ''زخمی سور کی طرح'') اس نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کردی اور گاندھی نے کھلم کھلا تشدد (مخالفت کرو اور جان دیدو) کا نعرہ بلند کیا۔ ملک بھر میں بلوے ہوئے، سرکاری دفاتر جلائے گئے، پولیس پر حملہ کیا گیا...... یہ وہی گاندھی ہے جس نے تحریک خلافت میں چند دیہاتیوں کے تھانے پر حملے کیوجہ سے (انگریز کی شہ پر) تحریک خلافت کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا تھا اور کانگریس کو اس تحریک کی حمایت

کرنے سے روک دیا تھا آج وہی گاندھی خود مارنے اور مرنے پر لوگوں کو اکسا رہا تھا۔

کانگریس کا خیال تھا کہ حسب سابق انگریز حکمران اس سے مرعوب ہوں گے لیکن انگریز پر ہندو کی مکاری اور فریب کھل چکا تھا۔ اس نے گاندھی اور دیگر لیڈروں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈالدیا اور یوں یہ ڈرامہ اپنے انجام کو پہنچا۔ کانگریس کا مطالبہ تھا کہ اسے یکطرفہ طور پر اقتدار دیدیا جائے لیکن قائداعظم نے یہ نعرہ لگایا کہ Divide india and go۔ مسلمانوں نے اس نعرے کو یہ شکل دی۔

بٹ کے رہے گا ہندوستان، بن کے رہے گا پاکستان

اس دوران 1945ء کو انتخاب کا اعلان کر دیا گیا۔ مسلم لیگ نے اپنے انتخابی منشور کو درج ذیل 3 نکات پر مرکوز رکھا۔

- ☆ دوقومی نظریہ
- ☆ ہندوستان اور پاکستان کیلئے جدا جدا دستور ساز اسمبلیاں
- ☆ پاکستان کی تشکیل

کانگریس اور ہمنوا جماعتوں بشمول متوسلین دیو بند جو مولانا حسین احمد مدنیؒ کے زیر اثر تھے ان سب نے مسلم لیگ کے ان نکات کی زبردست مخالفت کی لیکن یہ کرشمہ خداوندی ہے کہ اسی دیو بند کے ایک جید عالم اور دینی اثر و رسوخ رکھنے والی شخصیت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے متبعین (حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی) جیسے حضرات کی تائید و نصرت مسلم لیگ کو حاصل ہو گئی۔ اس سے مسلمانان ہند کی ایک عظیم اکثریت مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی اور یوں اس انتخاب میں مسلمانوں کی 30 نشستوں میں سے تمام نشستیں مسلم لیگ نے جیت لیں۔ 10 جنوری 1946 کو مسلم لیگ نے یوم فتح منایا اس کے بعد مختلف مراحل درپیش آئے جس میں کابینہ مشن کا منصوبہ اور اس کو رد کرنا، مسلم لیگ کی جانب سے راست اقدام جس کیوجہ سے کلکتہ میں مسلمانوں کا قتل عام شامل ہیں بالآخر لارڈ ویول کو یہ یقین ہو گیا کہ ہندو اور مسلمان ایک ملک میں نہیں رہ سکتے۔ اس دوران کانگریس نے حکومت تشکیل دی جس میں چند قوم پرست مسلمان شریک کئے گئے اور مسلم لیگ کی نشستیں خالی چھوڑ دیں۔ نہرو اور گاندھی لارڈ ویول سے ناراض تھے اس لیے انہوں نے اس کے خلاف وزیر برطانیہ کو لکھا کہ اسے تبدیل کر دیا جائے۔ انگریز شروع سے ہی مسلمانوں کے خلاف اور ہندو کا حامی تھا، اس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے بنا کر بھیج دیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا ذاتی کردار:

اس جگہ اپنی نوجوان نسل کی آگاہی اور معلومات کیلئے ہم چاہیں گے کہ انگریز قوم میں عمومی طور پر کردار اور اخلاق کی اس کمی کی جانب اشارہ کریں جس کا مظاہرہ انہوں نے ہندوستان میں تاجر کے روپ میں آکر دو صدیوں تک ہندوستان کے باشندوں کو اپنا غلام بنایا اور اپنے دور حکومت میں لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا، کروڑوں افراد کو بھوک، ننگ اور فاقہ کشی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا کیونکہ مختلف حیلے بہانوں سے ان کی جائیدادیں ضبط کر لیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کو اپنے لادین نظام تعلیم کے ذریعے اگرچہ پکا کافر تو بہت کم لوگوں کو بنا سکا تاہم ایک عظیم اکثریت کو گمراہی کی دلدل میں پھنسا دیا۔

اسی قوم کا ایک سپوت لارڈ ماؤنٹبیٹن بھی تھا۔ جب یہ وائسرائے بن کر ہندوستان آیا تو ہندو، انگریز کی کمزوری کو بخوبی سمجھتا تھا۔ اس نے ماؤنٹ بیٹن کو رام کرنے کیلئے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیئے۔ نہرو اور کرشنا منین نے اس کیساتھ دوستی بڑھائی اور نہرو (جو اس وقت جوان بھی تھا) لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی زلف کا اسیر ہو گیا۔

اس طریق پر ہندو اور ماؤنٹ بیٹن انگریز کے گٹھ جوڑ نے تقسیم ہندوستان کے اس آخری مرحلے میں مسلمانان ہند کے سینے میں ایسا خنجر گھونپا کہ جس کا زخم اب ایک ناسور کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جس سے نامعلوم کب نجات ملے۔

3 جون 1947 کو ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ملک کے منصوبے کا اعلان کیا مگر پاکستان میں شامل ہونے والے صوبوں میں پنجاب اور بنگال کو ہندو آبادی کی بنیاد پر تقسیم ہونا تھا سلہٹ میں ریفرنڈم ہوا جس میں پاکستان کے حق میں 24 لاکھ ووٹ آئے جبکہ مخالفت میں صرف 8 لاکھ ووٹ۔ اسی طرح صوبہ سرحد میں بھی ریفرنڈم ہوا (یہاں کانگریس

کی حکومت ڈاکٹر خان برادرِ کلاں عبدالغفار خان کے تحت قائم تھی) عبدالغفار خان (خدائی خدمت گار) اور جمعیت علمائے ہند کی مخالفت کے باوجود مسلمانانِ سرحد نے پونے تین لاکھ ووٹ پاکستان کے حق میں دیئے جبکہ پاکستان کی مخالفت میں صرف پونے تین ہزار ووٹ پڑے جس پر ابوالکلام آزاد، صدر آل انڈیا کانگریس نے خان برادران سے سخت باز پرس کی کہ وہ لاکھوں روپے جو انہیں سرحد میں ووٹ خریدنے کیلئے دیا گیا تھا اس کا کرشمہ کیوں کر ظاہر نہیں ہوا؟

ریڈکلف ایوارڈ:

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ پنجاب اور بنگال کو ہندو مسلم آبادی کے تناسب سے تقسیم ہونا تھا۔ اس لیے تقسیم کیلئے ایک باونڈری کمشن مقرر ہوا جس میں پاکستان کے نمائندے چودھری محمد علی (سیکرٹری خزانہ مسلم لیگ حکومت ہندوستان) اور ظفر اللہ خان تھے جبکہ کانگریس کی طرف سے کرشنا مینن نمائندے تھے۔ چودھری محمد علی مرحوم نے اپنی کتاب ظہور پاکستان (Emergence of Pakistan) میں اسکا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ اس سکیم کے مطابق پنجاب میں گورداسپور کا ضلع اور فیروز پور بھی پاکستان کے حصے میں آتا تھا کہ یہاں مسلم آبادی کی اکثریت تھی لیکن چودھری محمد علی کے بقول ایک دن جب وہ باؤنڈری کمشن کے دفتر آئے تو جو نقشہ تقسیم کیلئے بنایا گیا تھا اس میں ترمیم کی گئی تھی اور گورداسپور اور فیروز پور کو ہندوستان کے حصے میں دکھایا گیا تھا اس جگہ پھر ماؤنٹ بیٹن کی بے ایمانی اور ''لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور نہرو ناجائز تعلقات'' نے کام دکھایا لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پہلے ہی تقسیم نہرو کو دکھا دی۔ بنیا بہت ہوشیار تھا اسکی نظر کشمیر پر تھی کہ جس کا واحد زمینی راستہ گورداسپور سے ہو کر جاتا تھا۔ اس نے ماؤنٹ بیٹن کے ذریعے ریڈ کلف جو خود بھی ایک انگریز وکیل تھا (اور شاید جس کی سرشت ہی میں بے ایمانی اور دھوکہ دینا شامل تھا) نے نہرو کے کہنے پر یہ تبدیلی کر دی۔ ادھر جب چوہدری محمد علی نے اس معاملے پر بات کرنے پر اصرار کیا تو ہمارے دوسرے نمائندے ظفر اللہ خان نے جو کہ قادیانی خلیفہ غلام احمد مرزائی کا ماننے والے تھا اس مسئلے کو اٹھانے میں لیت ولعل کیا کیونکہ اس کے ''جعلی نبی'' کا مرکز اور قبر بھی گورداسپور کے علاقے قادیان میں تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ مرکز مسلمانوں کے ملک پاکستان میں چلا جائے کہ اسے بھی مسلمانوں سے خدشہ تھا جو کئی سال بعد مرزائی قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس طرح لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی وساطت سے نہرو نے انگریز وائسرائے کو مجبور کر کے گورداسپور کا علاقہ ہندوستان میں شامل کرا لیا جس وجہ سے بعد میں ہندوستان نے سری نگر پر فوجیں بھیج کر قبضہ کر لیا اور یوں کشمیر جو بقول قائد اعظم ''پاکستان کی شہ رگ'' ہے اور اس کے تمام دریاؤں کا منبع ہے ہم سے چھن گیا۔ یہ کام تو ہندو نے کیا۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھیئے کہ 1960ء میں جنرل ایوب نے سندھ طاس منصوبے کی منظوری دیکر کروڑوں روپے کے عوض ایک ایسا اقدام کر ڈالا جس کی وجہ سے چناب، راوی، ستلج، بیاس کے تمام دریا آج صحرا کا عملی نمونہ پیش کر رہے ہیں کیونکہ ہندوستان نے ان تمام دریاؤں پر 62 ڈیم بنا کر ان کا پانی پاکستان میں آنے سے روک لیا ہے۔ خدانخواستہ اگر اس کا کوئی مناسب حل نہ نکالا گیا تو آئندہ 10/15 سالوں میں ایشیا میں دوسرا اتھوپیا نہ بن جائے۔

ماؤنٹ بیٹن کے تقسیم ہند کے اعلان (3 جون 1947) کے فوراً بعد ہندوؤں نے ہندوستان کے کونے کونے میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ یاد رہے کہ گزشتہ صفحات میں ہم بالتفصیل بیان کر چکے ہیں کہ ہندو گزشتہ 50 سالوں سے اکھاڑوں میں جا کر ورزش کر رہے تھے اور چاقو تلوار اور خنجر چلانے کی مشق کر رہے تھے اور مہا سبھائی لیڈروں نے ان کے اندر ہندو دھرم کے احیاء کا جنون آمیز سبق سکھا دیا تھا۔ اس قتل و غارت میں سکھوں نے بھی ہندوؤں کا ساتھ دیا۔ مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کی گئی لاکھوں ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی عزت لوٹی گئی قتل کیا گیا اور آج بھی شاید ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ایسی بوڑھی عورتیں زندہ ہوں جنہیں بالجبر ہندو/سکھ بنا کر وہاں رہنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ قتل و غارت گری کے اس طوفان میں لاکھوں مرد و عورت، بوڑھے، جوان اور بچے پیدل چل کر اور بھوکے پیاسے رہ کر کہ راستے میں تالابوں اور کنوؤں میں ہندو سکھوں نے زہر ملا دیا تھا نہایت بے سروسامانی کے عالم میں

سرزمین پاک میں داخل ہو کر اللہ کے حضور سر بہ سجود ہوئے۔ ان حالات میں کہ جب انگریز نے برطانوی خزانے سے مسلمانوں کا حصہ بھی نہیں دیا تھا دفاتر میں سٹیشنری کی کمی کو اس طرح پورا کیا گیا کہ ایک ڈاک کے لفافے کو بار بار استعمال کیا جاتا تھا اور کاغذوں کو اکٹھا کرنے کیلئے پیپر پن کی بجائے کیکر کے کانٹے استعمال کیے جاتے تھے۔

ان تمام تر قانونی اور دستوری مراحل سے گزر کر 14 اگست 1947 کو ایک تقریب میں ماؤنٹ بیٹن نے کراچی آ کر بادشاہ برطانیہ جارج ششم کا اعلان منتقلی اقتدار اعلیٰ پڑھ کر سنایا اور اقتدار اعلیٰ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل حضرت قائد اعظم کو سونپ دیا۔ یوں برطانوی شہنشاہیت کی ایک طویل شب ختم ہوئی

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

انگریز اور ہندو نے بادل نخواستہ تقسیم ہند کا کڑوا گھونٹ تو پی لیا لیکن ان کے عزائم کیا تھے یہ ہے وہ سبق جو ہماری نوجوان نسل کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔

☆ وزیر اعظم برطانیہ لارڈ ایٹلی نے کہا ''ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے لیکن مجھے امید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکے گی اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ کر رہے ہیں ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔

☆ پنڈت نہرو نے تقسیم ہند کے فیصلے پر دستخط کرتے ہوئے کہا

''ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنانے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں گے کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیں۔

تشکیل پاکستان کا تاریخی پس منظر بیان کرنے کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ نوجوان نسل کی دوبارہ تعمیر حرم کو دعوت دی جائے۔ انہیں بتایا جائے کہ یہ پاکستان ایسے ہی نہیں بنا بلکہ اس کے پیچھے ایک طویل داستان قربانی و ایثار جدو جہد اور کشمکش کی ہے جو ہمارے اسلاف نے ہندو، انگریز گٹھ جوڑ اور اپنوں کی بے وفائی کے خلاف کی۔

معمارِ حرم باز بہ تعمیر حرم خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!

ابھی بندہ مومن اذاں سے فارغ ہی ہوا تھا کہ اللہ کریم کو اپنے اس بندے پر رحم آ گیا کہ وہ اپنے سینے میں زخم لیے ایک طویل عرصے سے چومکھی لڑائی میں مصروف عمل تھا اور اب تو اس نے خون بھی اگلنا شروع کر دیا۔ رب کریم کی رحمت نے اسے اپنے سایہ رحمت سے ڈھانپ لیا اور قیام پاکستان کے ایک ہی سال بعد 11 ستمبر 1948 کو وہ بطل جلیل ایک ابدی آرام گاہ میں جا کر سو گیا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ضرورت تو یہ تھی کہ تعلیمی نظام، فلم، ٹی وی اور دیگر تمام ذرائع سے کام لیکر اپنی نوجوان نسل کو ان تمام واقعات و حالات سے آگاہ کیا جاتا لیکن بوجوہ ایسا نہ ہو سکا۔ آپ کسی طالبعلم سے پوچھ لیں اسے اقبال کے چند اشعار بھی یاد نہیں ہوں گے بلکہ اگر یہ بھی کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اساتذہ کو بھی اب اپنی ملی تاریخ اور پاکستان کے مقصد وجود اور ان حالات کا علم نہیں جس طرح پاکستان خاک وخون کے دریا سے گزر کر بنا تھا۔ ہمارے اندر آج بھی ایسے ایسے لیڈران کرام موجود ہیں جو صوبائی سطح بلکہ علاقائی سطح سے بلند ہونے کو تیار نہیں۔

ان حالات میں ہماری گزارش شاید درخور اعتنا سمجھی جائے کہ کوئی پرائیویٹ ٹی وی چینل تحریک پاکستان کے تاریخی پس منظر، اقبال اور قائد اعظم بشمول دیگر زعمائے ملت اور ان کے کارناموں پر مشتمل فلم سیریز ضرور بنائیں جن کے ذریعے ہماری نوجوان نسل کو اپنے ماضی سے آگاہ کیا جا سکے اور وہ اپنا سر فخر سے اٹھا کر زندہ رہ سکے۔

☆......☆......☆

عمر کا تقاضا ہے

عمر کا تقاضا ہے
میں نے جو بھی کاتا ہے
اپنے ہاتھ سے دے دوں
اوڑھنیں خوابوں کی
کہکشائیں یادوں کی
رفتگاں کی تصویریں
اجلی دھندلی تحریریں
بالیاں حیا کی دوں
چوڑیاں وفا کی دوں
زیورِ صِلہ رحمی
اور معاملہ فہمی
رِیت پِیت کے کنگن
پیار سے بھرا آنگن
ایک خاص کرسی بھی
باعثِ خدا ترسی
کندہ آس ہے جس پر
مثلِ انجم و اختر

نقشِ عزم و ہمت ہے
موجبِ عنایت ہے
پاسباں ارادوں کی
ہے امین وعدوں کی
چھوٹی موٹی چیزیں ہیں
فرض کی رسیدیں ہیں
پیار سے سنبھالی ہیں
عادتوں میں ڈھالی ہیں
ڈر سا مجھ کو ہے لیکن
لائے نہ خدا وہ دن
میں جسے سمجھتی ہوں
زندگی کا سرمایہ
نسلِ نو سمجھ بیٹھے
اُس کو جنسِ بے مایہ

نجمہ یاسمین یوسف

غزل

جو جسم و جاں سے قریب نہ تھے وہ دھڑکنوں کے رقیب نکلے
جو چشم امکاں سے دور تر تھے نظر کے کتنے قریب نکلے

کہ فاصلہ بھی تو چاہیے تھا تمہاری اور میری قربتوں کو
جدائیوں کے تمام موسم ازل سے اپنا نصیب نکلے

تمہاری نظروں سے ہیں جو اوجھل تو کیا حقیقت ہے آج اپنی
کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہم ایسے حرماں نصیب نکلے

سمجھ نہ پایا میں آج تک بھی اس عشق ہیجاں کے فلسفے کو
تری محبت کے سب مراحل گماں سے بھی عجیب نکلے

ہو ظلمتِ شب مہیب کتنی تلاش کرتا ہے روشنی کو
کہ ڈھونڈتا ہے جسے زمانہ ہم اس سحر کے نقیب نکلے

آمنہ رمیصا زاہدی

غزل

پنچھی کیسی بھول میں ہے ہر پنجرے کا
خود سے خود کھل جائے گا در پنجرے کا

ظاہر میں آزاد دکھائی دیتے ہیں
لیکن سب کی روح کا اندر پنجرے کا

پیاروں کے خط پیار کے قیدی لائے ہیں
کب لایا ہے کوئی کبوتر پنجرے کا

آزادی کی خاطر سب تھے پھول مگر
گھاؤ ہے گھاؤ سے بڑھ کر پنجرے کا

ہر غم پر مسکان سجائی ہونٹوں پر
لیکن ہے برداشت سے باہر پنجرے کا

جب بھی پنچھی پنجرے کے بیدار ہوئے
حل جائے گا انجر پنجر پنجرے کا

ایسی آزادی لیکر کیا کرنا ہے
پنجرے جیسا جب ہو باہر پنجرے کا

آزادی کی شمعیں روشن کرنی ہیں
کرنا ہے تاریک مقدر پنجرے کا

کیا غم خوشیاں کیا آزادی پابندی
لگتا ہے سب باہر بھیتر پنجرے کا

کوئی تعلق کیوں آزاد پرندوں سے
جب کوئی ہے پیر، نہ سر، پر، پنجرے کا

حبیب الرحمٰن

قانتہ رابعہ

میرا سفر

میں ایک کیک ہوں۔

فروٹی، کریمی، پائن ایپل، فریش کیک......!

آیئے میں آپ کو اپنی کہانی سناؤں۔ عدم سے وجود کی کہانی۔ کچھ دن پہلے بلکہ کل ہی کی تو بات ہے میں شہر کے مشہور کریانہ سٹور پر مختلف بوریوں میں پڑا امیدہ تھا، چینی تھا، کشمش، انڈے، بیکنگ پاؤڈر، کریم، مکھن تھا، پائن ایپل اور اسٹرابری تھا، نہ جانے ''النور بیکرز'' والوں کے دل میں کیا سمایا کہ شہر بھر میں بینرز لہرا دیئے پینافلیکس لٹکا دیئے۔ وال چاکنگ شروع کر دی گئی کہ النور بیکرز والوں کی نئی برانچ کا افتتاح صوبائی وزیر خوراک کریں گے، یاد رہے یہ نئی برانچ شہر کے 'قلب' میں واقع کینٹ سٹریٹ، قائداعظم روڈ پر ہوگی۔

اس روز نئی برانچ کے افتتاح کی خوشی میں شہر بھر کے معززین کو مدعو کیا گیا۔ پہلے روز خریداروں کو خوشخبری سنائی گئی کہ ایک ہزار تک کی شاپنگ پر چیز ڈبل دی جائے گی یعنی ایک بریڈ خریدو گے تو دوسری فری میں ملے گی۔ مہمانان گرامی پر یہ عنایت کی گئی کہ انہیں النور بیکرز کی مٹھائی، کیک وغیرہ، گفٹ کے طور پر دیئے گئے۔

ہاں تو میں بتا رہا ہوں کہ میں ایک کیک ہوں!

میرے مختلف اجزاء کو مختلف جگہوں سے اکٹھا کیا گیا۔ چھان پھٹک کرنے کے بعد کسی کو گرائنڈر، بلینڈر یا ایگ بیٹر میں پیسنا پڑا۔ اُف! کوئی قیامت کا سماں تھا۔ زمین آسمان ایک ہو گئے۔ جیسے پتھروں کو پیس کر سرمہ بنایا جاتا ہے اسی مرحلے سے میں گزرا۔ دم بھر سانس بھی نہ لیا تھا کہ اب ایک اور مشین میں ڈال کر مجھے گوندھا گیا۔ میری خوب پھینٹی لگانے کے بعد میرا کچومر نکالنے کے بعد ایک اور جان لیوا مرحلہ سامنے تھا۔ درحقیقت وہی مرحلہ میری تخلیق کا تھا اور وہ تھا بڑے سارے تنور یعنی اوون میں ڈالنے کا خیر آگ خواہ تندور کی ہو یا بھٹی کی، چولھے کی ہو یا اوون کی......اس کا کام تو جلانا ہے...... جب مخصوص درجہ حرارت پر مجھے پکا کر باہر نکالا گیا تو میں خود آگ میں جل جل کر دہک رہا تھا۔ ایک تنکا ڈال کر مجھے چیک کیا سچی بات ہے گرم گرم دہکتے وجود پر وہ پتلی سی سلائی بھی تیر کی طرح لگی۔ لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میری مشقتیں کم ہو گئیں۔

پھر ماہر ہاتھوں نے مجھے بنانا سنوارنا شروع کیا۔ انسانی انگلیاں اس مہارت سے مجھے تراش رہی تھیں اور بناؤ سنگار کر رہی تھیں کہ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ جیسے آپ کو نرم نرم انگلیوں سے مساج کروانے کا مزہ ملتا ہے وہی مزہ آ رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہ نرم نرم انگلیاں مجھے دباتی رہیں، مساج کرتی رہیں اور میں سرور کی کیفیت میں رہوں۔ پر کہاں! انسان کی اپنی زندگی تو ہے ہی مشقت اور بے سکونی کی اس نے نجانے کیوں یہ ٹھان رکھی ہے کہ وہ سب کو ہی بے سکون کر کے رکھے گا۔ اس نے مجھے ایک عورت کے حوالے کر دیا جس نے مجھ پر کچھ نقش و نگار کے بعد کچھ کریم کی کوٹنگ کی پھر میٹھے، رس بھرے، ٹھنڈے ٹھنڈے...... (دیکھا آ گیا ناں منہ میں پانی......!) پائن ایپل، اسٹرابری کو میرے پاس بٹھایا۔ وہ تو مانو جیسے میرے نرم نرم وجود سے بے قابو ہی ہو رہے تھے۔ اس لئے علاج کے طور پر مجھے فریج میں رکھ دیا گیا۔ اس کے اندر کی دنیا بھی کیا دنیا تھی......! خیر یہ ایک الگ کہانی ہے۔ وہ پھر سہی مٹھائیاں، باداموں سے سجے کیک پیسٹریاں کوئی ایک مخلوق تھی اندر! مجھے ان سے کیا سروکار۔ بڑی مشکل سے جب میں اس ''برفیلی دنیا'' کا عادی ہوا تھا پھر نکال دیا گیا اور ایک رنگ برنگے دلہنوں کی طرح سجے ڈبے میں مجھے بٹھا کے پیک کر دیا گیا......!

اس پیک کرنے والے نے مجھے ایسی مدھ بھری آنکھوں سے

دیکھا اس کی ستائشی نظروں کی تاب لانا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ پھر بھی اپنے اوپر قابو ہی رکھا اور آرام سے کچھوے کی طرح منہ سر سب کچھ اس ڈبے میں چھپا لیا۔ اب جناب باہر کیا کیا کچھ مجھ پر چپکایا گیا، لٹکایا گیا کوئی کیا جانے؟ صحیح کہتے ہیں سیانے، جس تن لاگے سو تن جانے...... سوتن نا تو اس کو ہی بھگتنا پڑتا۔

سہ پہر کے بعد ایک بڑی ساری وین جس پر النور بیکرز کا بینر لہرا رہا تھا نظر آئی باقی بسکٹ، نمکو، پیسٹریوں کے ساتھ میں بھی اس میں دھکیل دیا گیا تاہم یہ شکر کا مقام ہے کہ میرے ساتھ نمکو بسکٹ کی نسبت کچھ امتیازی سلوک ہی ہوا اور اچھے ہاتھوں میں رہا۔ اب بھی میں سوچتا ہوں کہ اگر میرے ساتھ بھی وہی سلوک ہوتا جو بسکٹوں کے پیکٹ اور نمکو کیک رس کے ساتھ ہوتا تو کیا میں برداشت کر پاتا؟ ہرگز نہیں...... عزت نفس بھی کوئی چیز ہوتی ہے میں تو شاید اس بے عزتی کے صدمے کو سہار ہی نہ پاتا اور اِدھر اُدھر منہ چھپا کے لڑھک جاتا!

اس کے بعد مجھے وین سے اتار کر ایک فریج میں نئے سرے سے رکھا گیا۔ کان پھاڑ دینے والی موسیقی اور کبھی کبھار تقریروں کی آواز بھی آتی۔ اب کہاں تک سناؤں ایک دم ہی اعلان ہوا۔ مہمانان گرامی اور مہمان خصوصی اندر ہال میں جبکہ پبلک یہیں جلسہ گاہ میں رکی رہے ان کے لئے لذت کام و دہن کا یہیں پر بندوبست ہے۔ دھڑا دھڑ فریج کھولنے بند کرنے کی آوازیں آتیں کبھی جوس کبھی بوتلیں سب کچھ فریج سے نکال لئے گئے اور میں تنہا میری جان فریج میں قید......!

آپ کو تو پتہ ہے انتظار کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ ہو ہاؤ کی آوازیں آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو گئیں۔ بوتلوں کے ڈھکن کھلنے بند ہو گئے۔ اللہ حافظ، بہت مبارک ہو، جیسے الفاظ سنائی دیئے لیکن میری جان اسی منحوس فریج میں اٹکی ہوتی تھی۔ آپ کو تو پتہ ہے باہر کی دنیا کیسی ہوتی ہے۔ کیا میرا دل اس رنگ رنگیلی چھیل چھبیلی دنیا میں جانے کو نہیں مچل رہا تھا؟

النور بیکرز کے مالک نور عالم صاحب نے اپنے دست مبارک سے مجھے فریج سے نکالا۔ بہت احترام کے ساتھ بس اپنے آپ پر رشک ہی آ گیا۔ سچ بتاؤں صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے میں نے اپنے سے پیشتر نکالے جانے والے بسکٹوں اور نمکو کے پیکٹ وغیرہ کا تقابلی جائزہ لیا۔ دونوں ہاتھوں سے کیسے اندھا دھند مارا مار کر کے نکالے جا رہے تھے اور مجھے...... مری قسمت، زہے نصیب، نور عالم صاحب نے بنفس نفیس اپنے ہاتھوں سے نکالا اور بڑی عزت و تکریم کے ساتھ وزیر خوراک جناب رانا اکرام اللہ صاحب کو تھمایا اور کہا ہماری بیکری کے برانچ مینیجر صاحب نے خصوصی طور پر ڈیزائن کیا ہے آپ کے لیے۔

''بہت شکریہ'' کے لفظوں کے ساتھ رانا صاحب نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے مجھے پکڑا اور فوراً ہی اپنے سیکرٹری کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ رسمی الوداعی کلمات کے بعد مجھے اس شور شرابے والے ماحول سے نجات ملی اور میں نہیں جانتا تھا کہ میرا اگلا پڑاؤ کون سا ہوگا۔ بیس پچیس منٹ کے بعد رانا صاحب کی گاڑی ایک بڑے سارے بنگلے کے سامنے تھی رانا صاحب کا سیکرٹری مجھے اٹھا کے اندر لایا۔ رانا صاحب کی بیگم فون پر گفتگو میں مصروف تھیں۔ لیجئے جناب رانا صاحب اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول ہو گئے کون سا کیک اور کہاں کا کیک۔ ایک دم ہی رانا صاحب کی بیگم حیرت بھرے لہجے میں بولیں۔

''ارے یہ...... یہ تو کیک ہے۔''

''ہاں النور بیکرز والوں نے دیا ہے کہہ رہے تھے خاص طور پر میرے لئے ڈیزائن کیا ہے۔'' بڑے دھیان سے ان نسوانی و معطر ہاتھوں نے میرا اوپری لبادہ اتارا۔ اس سے قبل کہ میری رونمائی ہوتی پھر سے سیل فون پر گنگناتی رنگ ٹون ہوئی۔ ہیلو کہنے کی دیر تھی کہ ایک دم ہی ''کب، کیسے کے الفاظ کے ساتھ ہی گھر میں کہرام مچ گیا۔ مختلف آوازوں سے پتہ چلا کہ رانا صاحب کی بہن، بہنوئی اور دو بچے کسی ایکسیڈنٹ میں ختم ہو گئے تھے۔ مجھے تو ان کے رونے پیٹنے میں یہ بھی نہ یاد آیا کہ آنکھ کھول کے دیکھوں کون اتنی بے دردی سے مجھے فریج کا دروازہ کھول کر اندر پٹخ گیا۔

پھر میں تھا اور وہی سائبیریا کی ٹھنڈی ہوائیں......! اللہ جانے دو دن یا تین دن جب میرے اندر تک ٹھنڈ نے قلفی جما دی مجھے وہاں کے ماحول سے نجات ملی۔ رانا صاحب کی بیگم تعزیت کے لئے آنے والی اپنی بہن سے چپکے چپکے میرے بارے میں مشورہ کر رہی تھیں۔

"نہیں آپی، تعزیت کے لئے اگر پی ایم بھی آجائے تو کیک مٹھائی تھوڑا سرو کرتے ہیں، کیا ہو گیا ہے آپ کو؟

اچھا پھر جاتے ہوئے تم لے جانا، پیکنگ تو زبردست ہے یہاں ایسے ہی پڑا رہے گا۔

خطرے کی گھنٹی تو بج ہی چکی تھی شام ڈھلے وہاں سے بھی اذن رخصت ملا......!

بیگم رانا صاحبہ کی بہن نے مجھے اپنے گھر میں بھی نہ گھسنے دیا۔ راستے میں ہی ڈرائیور سے کہا۔

"نذیر......"

جی بیگم صاحب۔ ڈرائیور مودب لہجے میں بولا۔

"گاڑی کلمہ چوک کی طرف موڑ دو۔ دو چار منٹوں کیلئے ہاشمی صاحب کے ہاں چکر لگا لیں۔"

"بہتر بیگم صاحب......" ڈرائیور نے میرے اوپر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

ہاشمی صاحب کی مسز کو بھی آنے کی اطلاع دے دی گئی۔ دو چار مصنوعی قہقہوں حال چال پوچھنے کے بعد میں ان کی مسز کے حوالے کر دیا گیا۔

"آج النور جانا ہوا تھا، مجھے تو ان کے کیک ویسے ہی بہت پسند ہیں میں نے سوچا آپ کے لئے بھی لے لوں۔"

"ہائے بھابھی آپ نے ایسے ہی تکلف کیا۔" مسز ہاشمی نے ادا سے کہا۔ مہمانوں کے جانے کے بعد جب میں تھک ٹوٹ کر چور ہو چکا تھا، مسز ہاشمی کی عجیب سی آواز آئی۔

"منہ اٹھا کے کیک لے آئی ہیں۔ سمجھتی میں ان چونچلوں سے ہم ان کے ہاں رشتہ طے کر لیں گے۔ ہونہہ۔"

غصہ مسز رانا پر تھا اور نزلہ مجھ پر گرا۔ آدھی رات کو ہاشمی صاحب گھر میں داخل ہوئے تو مسز ہاشمی بن سنور کر تیار تھیں "میں ابھی آئی۔ کئی دن سے فیروز صاحب کے ہاں جانے کا سوچ رہی تھی انہوں نے گھر شفٹ کیا تھا۔ انوی ٹیشن بھی دی تھی قرآن خوانی کی۔ لیکن اس دن میں نے ڈاکٹر صاحب سے ٹائم لیا ہوا تھا جا نہ سکی۔ پتہ ہے وہ کتنی نائس ہیں میرے ہاں ہر موقع پر بہت محبت سے شریک رہی ہیں۔ بھابھی ڈنمارک سے بہت خوبصورت کرسٹل کا باؤل لائی تھیں، وہ لے جا رہی ہوں......"

اللہ جانے یہ اطلاع تھی یا اجازت لینا لیکن میرا سفر ان کے گھر سے فیروز صاحب کا شروع ہو چکا تھا۔ یہ شکر ہے زیادہ دیر نہ لگی بس دو ایک منٹ میں ہی پہنچ گئے۔

"ہائے بھابھی آپ کیسی ہیں؟ کتنی سمارٹ ہو گئی ہیں۔"

وغیرہ وغیرہ سے گفتگو کا آغاز ہوا۔ کرسٹل کے ڈیکوریشن پیس کے ساتھ میں بھی مسز فیروز کے حوالے کر دیا گیا۔ اپنی قسمت کو روتا پھر وہی فریج اور وہی قید تنہائی۔

مسز ہاشمی کی رخصتی کے بعد کسی بچے کی مہین سی آواز آئی۔

"ماما تھوڑا سا کیک لے لوں؟"

"نہیں...... بالکل نہیں، رات کے وقت تو بالکل بھی نہیں" وہ جو گتے کی پیکنگ سے باہر آنے کی سبیل نظر آئی تھی وہ بھی ختم ہوئی۔ میں شب تنہائی کا شکار پچھلی یادوں کو روتا رہا۔

اگلے دن صبح نو دس بجے ہی فیروز صاحب کے بیٹے نے سب کو الرٹ کر دیا تھا کہ آج میرے دوست کو لیپ ٹاپ ملنے والا ہے اور مجھے ان کے ہاں ضروری جانا ہے۔ بارہ بجے کے قریب فیروز صاحب کی مسز نے اپنے بیٹے کے کھلنڈرے ہاتھوں میں مجھے پکڑاتے ہوئے دس ہدایات دیں۔

دھیان سے موٹر بائیک چلانا۔

کیک کو آگے سٹینڈ پر ہی رکھنا۔

آنٹی کو یہ کیک دینا۔ وش ضرور کرنا۔

دوست کے ہاں صحیح معنوں میں بڑے موج میلے تھے۔ میری برادری کے دس کیک پڑے تھے۔ بادام، چاکلیٹ، پائن ایپل، لیکن وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ میری سج دھج سب سے ہی جدا تھی۔ ملے گلے کے بعد وسیع ہال میں چائے پارٹی تھی۔ سارے ڈبے کھلے۔ مجھے گھر والوں میں سے ہی کسی نے الگ کر لیا......رات گئے مجھے کھولا گیا......

واہ......! میرے مولا کی بنائی روشن دنیا اللہ جانے پانچ دن کے بعد یہ روشنی نصیب ہوئی، یا چھ دنوں کے بعد...... جونہی مجھے نکالا گیا تو ذرا سا چکھا گیا ہاتھ ایک دم رک گیا۔

''نہ بھئی بہت کریمی ہے۔ پہلے ہی کیلوریز برن کرتے کرتے حالوں بے حال ہو جاتے ہیں۔ سویٹی...... اس کو دوبارہ پیک کر دو۔'' ایک سولہ سترہ سال کی بچی نے مجھے اناڑی ہاتھوں سے پیک کیا اور فریج میں رکھ دیا۔

''کیک ہے اچھی بیکری کا بنا ہوا ہے ایسے کرتے ہیں منیر صاحب کی پرموشن ہوئی ہے وہاں نہ لے چلیں......'' غالباً گھر کے سربراہ کی آواز تھی۔

''ضرور ضرور......'' نسوانی آواز نے تائید کی۔ اگلے دن مجھے منیر صاحب کے ہاں پہنچایا گیا۔ میرے رنگ روپ میں پہلے جیسی چمک نہ تھی۔ پھر بھی گزارہ تو تھا۔ منیر صاحب کا گھر کئی تنگ و تاریک گلیوں، محلوں سے گزرنے کے بعد تھا۔ عصر کے وقت منیر صاحب کے بوڑھے لرزتے ہاتھوں میں جب پہنچا تو مجھے لگ رہا تھا اب میرے اوپر بھی یہ موسم آنے ہی والا ہے۔ منیر صاحب نے مجھے کچن میں رکھ دیا۔ وہاں پر خوب برتنوں کے کھنکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چائے بسکٹ، نگٹس، سموسوں کے ساتھ مٹھائی رکھی گئی۔ پتہ نہیں مجھے جان بوجھ کر نہ کھولا گیا یا رکھ کر ہی بھول گئے۔ واللہ اعلم۔ مجھے دوسری بات زیادہ قرین قیاس لگتی ہے۔ بھول ہی گئے ہوں گے ویسے بھی دو گھنٹوں کی گفتگو میں صاحب خانہ اپنے بھلکڑ پنے کی داستان ہی سناتے رہے۔ نیت پر شک کرنا تو ویسے ہی صحیح نہیں صبر شکر کے گھونٹ پیتا کچن کی گرمی سہتا رہا ان کی بیگم شاید میکے گئی ہوئی تھیں۔

پورے دو دنوں کے بعد وہ تشریف لائیں۔ سامان رکھا کھولا گیا۔ غالباً لمبے سفر سے آئی تھیں کھانا بازار سے آیا۔ جب چائے کی طلب ہوئی تو منیر صاحب اندر آئے۔ کچھ ناگوار سی بو آ رہی ہے۔ ناک سکوڑتے ہوئے ان کی بیگم نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''اف اتنے ڈھیر سارے برتن کون آیا تھا؟'' انہوں نے استفسار کیا۔

''فیروز صاحب آئے تھے، پروموشن کی مبارکباد دینے اور...... اوئے...... ہاں...... وہ کیا لائے تھے! یہ...... یہ......'' ایک دم ان کی نظر مجھ پر پڑی ''یہ کیک لائے تھے......'

بیگم صاحبہ سے پہلے ان کے بچوں نے میری چیر پھاڑ کی۔

''یہ...... کیک...... کیسا ہے؟'' کھانے والے نے ناگواری سے کہا۔

میرے وجود کا ایک ٹکڑا اور کاٹا گیا۔ ہاتھ منہ میں گیا اور تھوک دیا۔

''اُف یہ تو خراب کیک ہے......!''

میری آنکھوں میں پانی آ گیا۔

گھر کے ایک ایک فرد نے مجھے کاٹا، چکھا، تھوکا...... اتنی بے عزتی......!

''اٹھاؤ اسے باہر پھینک دو......''

ان کی چھوٹی بچی نے بڑی بے دردی سے مجھے باہر کوڑے کرکٹ والے ڈھیر میں پھینک دیا۔ چاروں طرف کیڑے، مکھیاں، سڑاند......

''اُف......'' میرا دم گھٹ رہا تھا...... سورج کی شعاعیں میرے وجود کو پانی پانی کر رہی تھیں اتنے میں باریک باریک بھوری چیونٹیوں کی فوج ظفر موج نے مجھے بے یارومددگار پڑا دیکھا تو میری طرف لپکیں...... اپنی طرف آتا دیکھ کے میں نے آنکھیں بند کر لیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

آہ میں کیا تھا...... اور آہ...... میں کیا ہوں؟

اے انسان...... کل تو کیا تھا...... آج تو کیا ہے؟

میں ایک کیک تھا......

☆......☆......☆

قمر پرویز

تین چیزیں

بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ اپنی اپنی پڑھائی میں مصروف رہتے ہیں۔ میں روزانہ کی ایک جیسی مصروفیات گھر کی دیکھ بھال، بچوں کی شوہر کی ضروریات پوری کرتے کرتے جیسے یکسانیت شکار ہوگئی۔ کسی چیز میں کوئی خوشی کوئی نیا پن نہیں تھا۔ زندگی عجیب بے رنگ سی ہوگئی تھی۔

ایسی صورتحال میں میرے میاں آگے آئے مدد کیلئے انہوں نے کہا۔ ''تم ایسے کرو لوگوں سے تعلقات بحال کرو۔ بھائی بہنوں سے ملو۔ پرانی دوستوں کے پاس جاؤ، پڑوسیوں سے میل جول بڑھاؤ۔'' یہ مشورہ مجھے بہت اچھا لگا۔ واقعی انسان سے مل کر جتنی طمانیت ملتی ہے اور کسی چیز سے نہیں ملتی۔

خیر سوچا سب سے پہلے اپنوں سے ابتدا کرنی چاہیے۔ بھائی ڈیفنس میں رہتے ہیں انہیں فون کیا کہ میں آ رہی ہوں آپ کے گھر۔ انہوں نے کہا۔ ''میں اور تمہاری بھابی گھر پر ہی ہیں ضرور آؤ۔''

لمبا فاصلہ طے کر کے بھائی کے گھر پہنچی۔ ملازم نے گیٹ کھولا تو بھائی سامنے ہی کھڑے تھے میں نے سلام کیا وہ مجھے ساتھ لے کر اندر گئے اور میں جیسے ہی بیٹھی ان کے فون کی گھنٹی بج اٹھی اور وہ فون پر باتوں میں مصروف ہو گئے اور میں بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد بھابی آئیں دعا سلام ہوا ایک دوسرے کا حال چال پوچھا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر بھابی اچانک بولیں احمد (میرا چھوٹا بیٹا) کیا کر رہا ہے آجکل؟ میں نے بتایا کہ ایف ایس سی پری انجینئرنگ۔ کہنے لگیں ''میڈیکل کیوں نہیں؟ میڈیکل کرواؤ اچھی کمائی ہوگی انجینئر بنا تو نوکری ہی ڈھونڈتا رہے گا۔''

پھر پوچھنے لگیں۔ ''بھائی صاحب کا کاروبار کیسا چل رہا ہے آج کل؟'' میں نے کہا۔ ''الحمدللہ'' کہنے لگیں۔ سپیئر پارٹس میں کیا رکھا ہے۔ انہیں کہو کپڑے کا کاروبار کریں اس میں بڑی بچت ہے۔

پھر اچانک سوال آیا۔ ''گروسری کہاں سے کرتی ہو؟''

میں نے کہا، بھابی قریب ہی مارکیٹ میں سٹور ہے وہیں پر ہر چیز مل جاتی ہے۔ کہیں اور جانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ہے۔ کہنے لگیں، کوئی ضرورت نہیں لمبی چیزیں لینے کی، جہاں سے میں گروسری کرتی ہوں وہیں سے تم بھی کیا کرو۔ اور میں، میں ہر بار بڑی سعادت مندی سے ''جی، جی'' کرتی رہی۔ اتنے میں ملازم چائے کی ٹرالی لے آیا ہم نے چائے پی، بھابی کے مزید مشورے سنے۔ پھر چلنے کی اجازت مانگی اور بھائی وہ تو ابھی تک موبائل میں ہی مصروف تھے۔ ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا اور فون لگائے لگائے ہاتھ کے اشارے سے خدا حافظ کہا۔

باہر آ کر گاڑی میں بیٹھی۔ ڈرائیور نے پوچھا کدھر، میں نے کہا، گھر ہی چلتے ہیں۔ اور بے اختیار زبان پر مرزا غالب کا یہ شعر آ گیا۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

گھر آ کر پھر کاموں میں مصروف ہوگئی، لیکن ذہن ماضی میں ہی الجھا رہا۔ کتنے پیارے اور معصوم دن تھے، سب سہیلیاں جڑ کے بیٹھ جاتی تھیں اپنی اپنی باتیں سناتیں۔ ایک بولتی اور ساری پوری توجہ سے سنتیں اور سنانے والی کو لگتا کہ جیسے دل ہلکا ہوگیا ہے۔ جب وہاں سے گھر جانے کے لیے اٹھتے تو ہلکے پھلکے خوش باش ہوتے۔ ایک دوسرے کے لیے محبت دوگنا ہو جاتی۔

ایک دو دن بعد سوچا بچپن کی دوست بشریٰ سے ملنے چلتی ہوں۔ عرصہ ہی ہو گیا ہے اس سے ملے ہوئے۔ میں نے فون کیا پوچھا، ''آ جاؤں تم سے ملنے کے لیے؟'' کہنے لگیں ''نہیں نہیں ابھی بہت مصروف ہوں۔ آج ڈنر پر جانا ہے۔ کل لنچ ہے پرسوں شاپنگ کا پروگرام ہے۔ ایسا کرو تم اگلے ہفتے آ جاؤ۔''

خیر میں اگلے ہفتے ان کے بتائے ہوئے وقت پہنچ گئی۔ وہ گھر پر تو

موجود تھیں۔ مجھے دروازے پر لینے بھی آئیں لیکن فون کان سے لگائے۔ باتوں سے لگ رہا تھا کہ کسی کے ساتھ پارٹی کا پروگرام بن رہا ہے۔ ایک ہاتھ سے گلے لگایا اور مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور خود فون پر باتیں کرتی رہیں۔ اللہ اللہ کر کے فون سے فارغ ہوئیں۔ چھوٹتے ہی پوچھا ''گرمیوں کے لئے لان لے آئی ہو؟'' میں ابھی جواب سوچ ہی رہی تھی کہ کہنے لگیں، ''بھئی میں تو ہر ڈیزائنر کے دو دو جوڑے لے آئی ہوں گرمیوں میں کچھ گزارا ہو ہی جائے گا۔'' مجھ سے تو ڈیزائنر کے علاوہ پہنے ہی نہیں جاتے ہیں۔ ابھی گاڑی بھی بدلی ہے۔ ماڈل پرانا ہو گیا ہے۔ تمہاری گاڑی کا کونسا ماڈل ہے interior decorations بھی کروانی ہے سنو تم کس سے کرواتی ہو decoration؟''

اتنے سارے حملوں سے میں پریشان ہو گئی۔ مجھے بھلا کیا لینا دینا گاڑی کے ماڈل سے اور interior decoration سے مجھے تو چار پہیوں والی چیز چاہیے جو مجھے مطلوبہ جگہ پر پہنچا دے اور بس۔

تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی بڑی پر تکلف قسم کی۔ کھانے کی ہر چیز Branded لگ رہی تھی گھر کا بنا ہوا کچھ نہیں تھا سوائے چائے کے۔ شاید کچھ دنوں میں چائے بھی باہر سے آنے لگے۔ میں نے چائے پی پھر اجازت چاہی۔ اس دوران وہ فون پر باتیں کرتی رہیں۔ چلتے وقت بڑی خوش اخلاقی سے رخصت کیا اور آئندہ آنے کی بھی تاکید کی۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں سوچ رہی تھی یہ وہی بشریٰ ہے جس کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر بھی باتیں ختم نہیں ہوتی تھیں۔

اب رہ گئے پڑوسی، ان کا بھی حال سن لیجئے ہمیشہ دل میں ایک کسک رہی کہ اللہ تعالیٰ نے پڑوسیوں کے اتنے حقوق رکھے ہیں اور ان کی ادائیگی میں میں کوتاہی کرتی ہوں۔ میں نے سوچا اب وقت ہے اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گی۔ دس گیارہ بجے کام سے فارغ ہوئی تو ساتھ والے پڑوسیوں سے ملنے نکلی۔ بیل دی تو خاتون خانہ باہر آئیں بڑی گرم جوشی سے خوش آمدید کہا، اندر لے جا کر بٹھایا، چائے بنائی ساتھ گھر کے بنے ہوئے لذیذ کباب تھے، بہت اچھا لگا۔ باتیں شروع ہوئیں۔ پوچھنے لگیں، ''آپ کا بڑا بیٹا کس کالج میں ہے؟'' میں نے بتایا تو کہنے لگیں، ''میرا تو کنگ ایڈورڈ میں ہے۔ بڑا ذہین ہے بڑا قابل ہے۔'' میں نے کہا، ''ماشاءاللہ'' پھر فرمایا ''گھر میں تین تین گاڑیاں ہیں لیکن میرے لئے کوئی فارغ ہی نہیں ہوتی ہے۔ آپ کے ہاں کتنی ہیں؟'' میں نے کہا، ''ایک ہی ہے اور بہت کافی ہے ہمارے لیے۔''

وہاں جتنی دیر میں بیٹھی مجھے اپنی محرومیوں کی اطلاعات ملتی رہیں اور جب مجھے اپنی کم مائیگی کا مکمل یقین ہو گیا تو اس ارادے کے ساتھ چلنے کی اجازت چاہی کہ آئندہ ادھر کا رخ نہیں کروں گی۔

گھر آ کر میں سوچتی رہی کہ انسانوں میں آجکل اتنی دوریاں کیوں پیدا ہو گئی ہیں؟ شاید اس کی وجہ تین بہترین چیزوں کا غلط استعمال ہے یعنی مشورہ، موبائل اور مقابلہ۔

☆......☆......☆

بھول

دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ انصر جو لیپ ٹاپ پر اپنا آفس کا کام کر رہا تھا اس نے چونک کر دروازے کو دیکھا اور ''آجائیں'' کہہ کر پھر نظر اسکرین کی جانب کرلی۔

کمرے میں آنے والی امی تھیں جو ہاتھ میں چائے کی ٹرے لے کر آئی تھیں اور اب میز پر وہ ٹرے رکھ رہی تھیں۔

''ارے امی یہ چائے آپ کیوں لے کر آئیں؟ مجھے باہر بلوا لیتیں۔'' انصر کچھ شرمندگی سے بولا تھا۔

''رافعہ کہہ کر تو گئی تھی تم کو چائے کا۔''

''کب؟''

''ابھی دس منٹ پہلے''

''اوہ، ہاں وہ میں شاید بھول گیا تھا۔''

''تم نے اپنے آپ کو بہت مصروف کرلیا ہے بیٹا، اب یہی دیکھو پہلے تم آفس کا کام، آفس ہی میں کرتے تھے، لیکن اب گھر پر بھی لانے لگے اور رات گئے تک اس کے آگے بیٹھے رہتے ہو۔'' امی نے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''امی کیا کروں کام ہی اتنا ہوتا ہے۔''

''کام اتنا ہوتا نہیں ہے جتنا تم نے خود بڑھا لیا ہے۔'' امی اسکو چائے کی پیالی پکڑاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ''ایسا کب تک چلے گا بیٹا؟''

اور اس بات کے جواب میں انصر نظریں چراتے ہوئے دوبارہ سے اسکرین کو غور سے دیکھنے لگا اور آہستہ آہستہ چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ امی بھی خاموشی سے چائے کے گھونٹ بھرتی رہیں۔

☆......☆......☆

''آج آپ آفس سے کچھ جلدی اٹھ جائیں۔'' وہ چادریں تہہ کرتے ہوئے شیشے میں میاں کے عکس کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیوں؟ آج ایسا کیا خاص دن ہے جو میں آفس کے کام چھوڑ دوں۔'' وہ کچھ استہزائی انداز میں بولا اور آئینہ میں دیکھتے ہوئے اپنی ٹائی کی ناٹ درست کرنے لگا۔

''بچوں کی ضرورت کی کچھ چیزیں لینی ہیں، شاہا کب سے ضد کر رہی ہے اسے باربی ڈول لینی ہے اور عون کی بھی......''

''یہ بچوں کی ضروریات اور تمہاری فرمائشیں کچھ بڑھتی نہیں جا رہیں؟'' وہ ماتھے پر بل ڈال کر بیوی کی بات کاٹتے ہوئے کچھ سوالیہ انداز میں بولا اور پھر ایک نظر اسے دیکھ کر میز پر سے اپنی فائل اٹھا کر دیکھنے لگا۔

''نہ تو بچوں کی ضروریات میں اضافہ ہو رہا ہے اور نہ ہی میری فرمائشوں میں، میں صرف ان ہی چیزوں کا مطالبہ آپ سے کرتی ہوں جس کی حقیقتاً ہمیں ضرورت ہے۔ اگر شاہا ایک گڑیا کیلئے کہہ رہی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے وہ تو چھوٹی سی بچی ہے اور بچیاں تو گڑیا سے کھیلتی ہی ہیں، آگے سردی آرہی ہے مجھے عون کیلئے گرم کپڑے چاہئیں۔''

''بس شروع ہوگئی تمہاری تقریر، ایسا ہی شاپنگ کا شوق آرہا ہے تو چلی جاؤ، میں تو بہت مصروف ہوں، میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔'' اس نے فائل بند کرتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ ''ناشتہ لاؤ مجھے دیر ہو رہی ہے'' باہر سے آواز آئی اور وہ سینے میں مقید سانس آزاد کرتے ہوئے حکم کی تعمیل کیلئے باہر آگئی۔

''کل شاہا کے اسکول میں پیرنٹ ٹیچر میٹنگ ہے۔'' رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ جہاں وہ چینل سرچنگ کر رہا تھا۔

''تو؟'' اس نے بغیر گردن گھمائے ٹی وی پر نظریں مرکوز کیے ہی

پوچھا۔

"تو؟ تو کیا پھر آپ کو چلنا ہے۔" وہ کچھ نا سمجھی سے بولی۔

"میں تمہیں شکل سے اتنا ہی احمق نظر آتا ہوں، آفس چھوڑ کر وہ معمولی سی میٹنگ اٹینڈ کروں؟" موڈ کچھ خراب ہو چکا تھا۔

"بچوں کی یہ میٹنگ بڑی اہم ہوتی ہیں، اور تقریباً سب بچوں کے ہی والدین آتے ہیں۔"

"آتے ہوں گے، مگر میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے، تم چلی جانا۔" تیوریاں کے بل بڑھنے لگے تھے۔

"زیادہ دیر نہیں لگے گی صرف آدھا گھنٹہ۔"

"بس کہہ دیا نا، بحث نہ کرو۔" اس نے ریموٹ اچھالا اور غصہ سے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

"امی میری وہ گرے والی شرٹ کہاں ہے؟" وہ سخت جھنجھلا رہا تھا۔

"کون سی؟" امی جو جائے نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں چونک کر پوچھنے لگیں۔

"وہی جس پر کالی دھاری ہے۔"

"الماری میں ہی ہوگی اور کہاں جائے گی تم ٹھیک سے دیکھو۔"

"میں نے ساری الماری چھان ماری نہیں مل رہی"

"تو پھر دوسری پہن لو، ایسی کیا بات ہے۔" امی، اس کے پیچھے کمرے میں آتے ہوئے بولیں اور شرٹ ڈھونڈنے لگیں۔

"بھائی آپ ناشتہ کر لیجئے گا، اچھا امی میں جا رہی ہوں۔" اریبہ نے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا اور واپسی کیلئے مُڑی۔

"ارے اریبہ! بیٹا تم نے تو بھائی کی وہ گرے اور کالی دھاری والی شرٹ کہیں نہیں دیکھی؟"

امی نے کالج کیلئے جاتی بیٹی سے سوال کیا۔

"گرے والی؟ بھائی میں نے آپ کی نیلی چیک والی شرٹ استری تو کر دی تھی، آفس کے لئے، اریبہ جلدی سے بولی۔

"وہ نہیں چاہیے، گرے والی چاہیے۔" انصر سخت جھلا رہا تھا۔

"گرے والی......!" وہ کچھ ٹھٹکی "ہاں وہ تو میلے کپڑوں میں ہے، دو دن سے ماسی نہیں آ رہی نا تو کپڑے بھی نہیں دھلے، آپ بلو والی پہن لیں نا، کیا فرق پڑتا ہے، اچھا میری وین آتی ہوگی، امی میں جا رہی ہوں، خدا حافظ۔" وہ کہتے ہوئے دروازے سے نکل گئی تھی اور انصر نے سر تھام لیا امی بھی جو الماری میں ہینگ ہوئی شرٹوں کو دیکھ رہی تھیں۔ رک گئی تھیں۔

"کیا فرق پڑتا ہے" اس نے غصہ سے بہن کے الفاظ دہرائے "میلی تھی تو دھو دیتیں اب ماسی نہیں آئے گی تو کیا کپڑے بھی نہیں دھلیں گے؟"

"اچھا بس بس، اس کے پاس کہاں اتنا ٹائم ہوتا ہے، رات کو کر تو دیتی ہے تمہارے کپڑے استری، تمہارے تو مزاج ہی نہیں ملتے اور ڈھیروں شرٹ ہیں ان میں سے پہن لو۔" امی بھی کچھ خفگی سے کہتی کمرے سے باہر چلی گئی تھیں اور وہ وہیں بیڈ پر بیٹھ گیا۔ صبح ہی صبح چھوٹی سی بات پر موڈ سخت خراب ہو چکا تھا۔

"انصر، مصروف ہو؟" آفس سے آنے کے بعد اب چائے پی کر وہ اخبار دیکھ رہا تھا کہ امی اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"جی؟ ہاں......نہیں تو۔" وہ چونک کر امی کو دیکھتے ہوئے بولا اور دوبارہ سے اخبار دیکھنے لگا۔ امی کچھ دیر تو بڑے صبر سے اس کے اخبار رکھنے کا انتظار کرتی رہیں لیکن جب کافی دیر اسی طرح گزر گئی تو انہوں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر گویا اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"اوہ! جی امی کیا آپ کو مجھ سے کچھ کام ہے؟" وہ کچھ شرمندگی سے اخبار تہہ کرتے ہوئے بولا۔

"کام ہے تو یہاں تمہارے پاس بیٹھی ہوں۔" امی سنجیدہ تھیں۔

"جی؟"

"انصر، ایسا کب تک چلے گا؟"

"کیا؟ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

"امی پلیز، میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"لیکن میں اس معاملے کو اب کسی نتیجے پر پہنچانا چاہتی ہوں، پانچ سال گزر گئے تم اپنی ضد پر قائم ہو، اگر تم رابعہ کو واپس نہیں لانا چاہتے تو ٹھیک ہے، اگرچہ میں رابعہ کو ہی واپس بلانے کے حق میں ہوں لیکن تم نے ہر ایک سے ضد باندھی ہوئی ہے۔ بہر حال اب تم شادی کر لو، اریبہ اپنے کالج میں مصروف پھر اس کی پڑھائی ہے بھی سخت، رافعہ ابھی چھوٹی ہے۔ رہ گئی میں تو تم دیکھتے ہی ہو میری طبیعت اب آئے دن خراب ہی رہتی ہے۔ بیٹا تمہیں اور اس گھر کو ایک عورت کی ضرورت ہے جو اچھی طرح اپنی ذمہ داری سنبھال سکے۔" امی نے اپنی طویل بات بیٹے تک پہنچائی۔

"اگر آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ اپنے کام میں خود کروں تو میں آپ کو اور اریبہ کو آئندہ تکلیف نہیں دوں گا، اب خیال کروں گا۔" انصر کے لہجے میں تلخی عود کر آئی تھی۔ صبح والا واقعہ ایک دم تازہ ہو گیا تھا۔ "یہی تو تمہاری بات غلط ہے، بات کو کہیں کا کہیں لے جاتے ہو، رابعہ کے ساتھ بھی تمہارا کچھ اسی طرح کا رویہ تھا۔ کبھی اپنی غلطی تسلیم نہیں کی، ہمیشہ اپنی انا کا جھنڈا ہی بلند رکھا......"

"امی پلیز اب آپ گڑے مردے نہ اکھیڑیں۔"

"کیوں نہ نکالوں، آخر یہ تمہاری زندگی کا معاملہ ہے، اگر رابعہ کے ساتھ گزارا نہیں ہے تو دنیا بھری پڑی ہے لڑکیوں سے، میں تمہاری دوسری شادی کر دوں گی، کیوں اپنی زندگی کو روگ لگائے بیٹھے ہو۔" آج شاید امی بھی تہیہ کئے بیٹھی تھیں اسے کسی فیصلہ پر لانے کی۔

"دوسری شادی کے بارے میں تو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا، یہ بات میں آپ سے پہلے بھی کئی دفعہ کہہ چکا ہوں۔ رابعہ کے علاوہ اب کوئی لڑکی میری زندگی میں نہیں آئے گی۔"

"عجیب منطق ہے، ایک طرف تم دونوں اپنی ضد پر اڑے بیٹھے ہو، کوئی بھی جھکنے کو تیار نہیں، نہ ہی تم دونوں کو اپنے بچوں پر رحم آتا ہے، تو دوسری طرف تم دوسرا نکاح بھی کرنے کو راضی نہیں، کیا ساری زندگی ایسے ہی بے معنی گزار دو گے؟" اب امی برہمی سے اُسے تیز آواز میں بول رہی تھیں۔

"ایک ہی تلخ تجربہ بہت ہے اور جہاں تک بچوں کی بات ہے تو وہ وہاں بہت اچھی طرح ہیں۔"

انصر نے اتنا کہہ کر اخبار واپس اٹھا لیا تھا جس کا مطلب تھا کہ اب وہ مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا اور امی ایسے ہی اس کے آگے نہ جانے کتنی دفعہ سر پٹخ کر رہ گئی تھیں۔ لیکن انصر نے بھی ہٹ دھرمی کے نئے ریکارڈ رقم کر دیئے تھے۔

☆......☆......☆

"مجھے رات کو امی کے ہاں سے پک کر لیجئے گا۔" وہ اسے چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے بولی۔

"آج پھر۔" چائے کی پیالی پکڑتے ہاتھ لحہ بھر کو تھم گئے۔

"ہاں وہ شاپنگ کیلئے جانا ہے تو......" وہ بات پوری کرتے ہوئے ہچکچائی۔

"یہ آخر تم لوگوں کی شاپنگ کب پوری ہو گی؟" اس نے پیالی کو میز پر پٹخ ہی تو دیا کتنی ہی چائے میز پر چھلک گئی تھی۔ "ڈیڑھ مہینہ ہو گیا، ہر دوسرے دن شاپنگ پر جانا ہوتا ہے، کیا سارا شاپنگ پلازا خرید کر دم لو گے تم لوگ؟"

"شادی کی شاپنگ ہے، ٹائم تو لگتا ہے۔" وہ دبی آواز میں کھسیاتے ہوئے بولی۔

"شادی، شادی، آخر ایسی کون سی مہارانی ہے تمہاری بہن جس کی شادی پر پیسہ پانی کی طرح بہا رہے ہو تم لوگ۔" وہ غصہ سے چیخ کر بولا تھا۔

"ایسی بات تو نہیں ہے، امی کی طبیعت ٹھیک نہیں چل رہی اس لئے مجھے شفق کے ساتھ چلنا پڑتا ہے، بچے امی رکھ لیتی ہیں اور پھر میرے علاوہ ان لوگوں کا ہے ہی کون، ہم صرف دو ہی تو بہنیں ہیں، ہم ہی اگر ایک دوسرے کا ساتھ......"

"اچھا مجھے زیادہ باتیں نہیں سننیں، تمہارے وہ درجن بھر رشتہ دار کہاں چلے گئے، جن سے تم لوگ بڑا سلوک دکھاتے تھے جو ہر وقت

تمہارے گھر موجود رہتے تھے اب وقت پڑنے پر وہ سب کہاں گئے؟ اب یاد آگئی تو بیٹی، گھر اور شوہر کو چھوڑے بازاروں میں پھرتی رہے، تم نے جانا ہو تو جاؤ لیکن اب میں نہیں آؤں گا تم کو لینے۔'' اس نے چائے کے ساتھ بات بھی ختم کی اور بگڑے زاویوں کے ساتھ آفس کیلئے نکل گیا۔

پیچھے وہ اپنے آنسو ضبط کرتی ناشتہ کے برتن سمیٹنے لگی۔

''صحیح کہتے ہیں، شادی کے بعد بیٹیاں پرائی ہو جاتی ہیں، اپنے والدین اور ان کے کاموں کیلئے بھی شوہر کی اجازت کی محتاج ہیں۔ شوہر کی مرضی کے بغیر وہ ان خون کے عزیز رشتوں اور اٹوٹ ناطوں سے بھی تعلق نہیں نبھا سکتیں۔'' وہ سسکیاں لیتے ہوئے کتنی دیر سوچتی رہی اور پھر بہن کو فون کر کے آج بازار جانے سے معذرت کر لی، بہانے بہت تھے اس نے بھی ایک مضبوط بہانہ بنا لیا۔

''آپی پلیز تھوڑی دیر کیلئے چلی چلیں، آپ کو پتہ ہے نا آج کتنا ضروری جانا ہے۔ دکاندار نے کہا تھا آج میں خاص آپ لوگوں کیلئے وہ ڈیزائن منگواؤں گا، اگر ہم آج نہ گئے تو پھر تو وہ ڈیزائن ہمارے ہاتھ سے گیا، جیولر نے بھی آج کی تاریخ دی ہوئی ہے۔'' کتنی منت کر رہی تھی شفق اس سے لیکن اس نے بھی اپنے بہانہ کو مضبوط ثابت کرنے کیلئے دس اور بہانے گھڑ لئے۔ آخر کار شفق نے ناراضگی سے فون بند کر دیا تھا۔

''کوئی بات نہیں، شفق کو تو منایا جا سکتا ہے لیکن سر کے تاج کو منانے کیلئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔'' اس نے ریسیور رکھتے ہوئے سوچا۔

شفق کی شادی خیر و عافیت سے گزر گئی تھی اگرچہ اس دوران بھی وہ میاں کے پل پل بدلتے مزاج سے خوفزدہ ہی رہی۔ مہندی، شادی، ولیمہ تینوں فنکشن بے حد مصروف اور تھکا دینے والے تھے۔ ایک تو ساری ذمہ داری اس اکیلی کے ہی ذمہ تھی، ابو کی موت کے بعد امی ویسے بھی ہر مشورہ ان دونوں میاں بیوی سے ہی کرتی تھیں اور شادی جیسے بڑے کام کو کرتے ہوئے وہ ویسے بھی بے حد گھبرا رہی تھیں۔ اس کی دفعہ تو ابو حیات تھے۔ لیکن اب تو ایسا لگتا تھا کہ ایک ابو کے نہ ہونے سے وہ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی کے باوجود بھری دنیا میں اکیلی ہیں۔ اب رابعہ کا ہی دم ان کے لئے غنیمت تھا۔ ولیمہ کے اگلے دن ہی انصر نے رابعہ کو گھر چلنے کا اشارہ دے دیا تھا۔

''آج؟؟ نہیں انصر میں ابھی نہیں جا سکتی، آپ دیکھ رہے ہیں شفق کے بعد امی بالکل اکیلی ہوگئی ہیں۔ شادی کی مصروفیات کی وجہ سے بہت تھکی ہوئی بھی ہیں۔ بی پی بھی بہت لو ہے ابھی نہیں، پلیز......'' رابعہ نے بہت منت سے کہا۔

''یہ ابھی سے تمہاری کیا مراد ہے؟ ہفتہ، دس دن، مہینہ، چھ مہینہ یا سال۔'' ایک دم ہی اسکا پارہ ہائی ہو گیا تھا اور رابعہ تو ہکا بکا ہی رہ گئی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں کیوں مہینہ رہنے لگی، بس دو تین دن کی بات ہے، امی کی طبیعت کل تک انشاءاللہ سنبھل ہی جائے گی اور میں گھر سمیٹ لوں، کل امی نے شفق اور اس کے میاں کو بھی بلایا ہے رات کھانے پر تو بس پرسوں......'' وہ ڈرتے ڈرتے، کچھ اٹکتے ہوئے بولی لیکن حسب معمول انصر غصہ میں اپنے حواس چھوڑ چکا تھا۔

''رہو، شوق سے رہو، ایک تم ہی تو رہ گئی ہو ساری دنیا میں......''

وہ اسی طرح بہت کچھ کہتا تن فن کرتا چلا گیا اور رابعہ آنسو پیتی رہ گئی، ایک طرف بوڑھی تنہا بیمار ماں تھی تو دوسری طرف اس کا گھر، فیصلہ بہت مشکل تھا لیکن اس نے دل کڑا کر کے کر لیا تھا، وہ صبح ہی امی کو ناشتہ کرا کر اور دوا دے کر گھر چلی جائے گی اور پڑوس کی آنٹی سے ان کا دھیان رکھنے کو کہہ دے گی، پھر رات میں انصر اور بچوں کے ساتھ آجائے گی۔ دعوت کے کھانے کا انتظام بازار سے کر لیا جائے گا۔ اس نے جیسے سارا پروگرام خیالوں میں ہی ترتیب دے لیا۔

امی کو اس نے کچھ نہ بتایا تھا ورنہ وہ تو شاید اسی وقت ہی اسے انصر کے ساتھ چلتا کر دیتیں فیصلہ کر کے وہ کسی حد تک مطمئن ہو گئی تھی۔ رات کو بچوں کو سلا کر اور امی کو ان کی دوا دے کر رات گئے تک وہ کام نپٹاتی رہی شادی کی وجہ سے ہر چیز اپنی جگہ سے الٹ پلٹ ہو گئی تھی۔ دیر سے سونے کی وجہ سے آنکھ بھی صبح دیر سے کھلی۔ نماز پڑھ کر اس نے امی کے کمرے میں جھانکا وہ ابھی تک سو رہی تھیں تب اس نے سوچا پہلے ناشتہ کی

Found

تیاری کرے پھر امی کو اٹھائے۔ابھی بچوں کو اٹھانا بھی ایک مرحلہ تھا۔امی کو آوازیں دیتی وہ ان سے اٹھنے کا کہنے آئی تو ایک دم ہی گھبرا گئی۔امی تو بے سدھ پڑی تھیں کتنی ہی آوازیں دینے کے بعد انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں۔

''امی کیا ہوا آپ کو'' وہ رندھی ہوئی آواز میں ان سے پوچھ رہی تھی۔لیکن وہ کیا کہتیں معصومیت سے اسے دیکھنے لگیں۔''اوہ کہیں آپ کی شوگر تو نہیں گری ہوئی۔'' اسے یکدم خیال آیا پھر وہ پڑوس سے آنٹی کے بیٹے کو بلا لائی۔وہ میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔اس نے فوراً بی پی اور شوگر ٹیسٹ کیا۔دوائیاں دینے اور اچھی طرح خیال رکھنے کا کہہ کر چلا گیا اور وہ جواب میں سر ہلاتی اور اپنے دل کو سنبھالتی، دماغ قابو میں کرتی رہ گئی۔اور وہ جو گھر جانے کا پلان بنائے بیٹھی تھی، بے بسی سے اپنی جان سے پیاری ماں کو دیکھتی رہ گئی۔امی کو ضروریات سے فارغ کرا کر انہیں ناشتہ کرایا اور پھر دوائی دی جس کے بعد امی کافی پرسکون ہو گئی تھیں۔دوا کے اثر سے انہیں جلد ہی دوبارہ نیند آ گئی تھی۔لیکن اب ایسی حالت میں وہ ماں کو کسی صورت چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔''اگر امی کو کچھ ہو گیا؟'' یہ خیال ہی اس کی جان نکالنے کیلئے کافی تھا۔باپ کے بعد وہ ویسے بھی بہت کمزور دل ہو گئی تھی۔امی کو سلا کر اس نے بچوں کو ناشتہ کرایا اور پھر انصر سے بات کرنے کا سوچا انصر کو فون کر کے اس نے ساری صورتحال بتائی کہ کیسے وہ صبح ہی آ رہی تھی لیکن امی کی اچانک خراب ہونے والی طبیعت نے اسے دوبارہ وہیں رکنے پر مجبور کر دیا۔

''بس کہہ چکیں۔'' ساری تفصیل سننے کے بعد انصر نے کہا بھی تو کیا، وہ حیران رہ گئی۔

''جی؟'' وہ سمجھی نہیں تھی۔

''ٹھیک ہے خدا حافظ۔'' اس نے اتنا کہا اور کھٹ سے فون بند کر دیا اور وہ حیران پریشان ریسیور کو دیکھتی رہ گئی۔نہ امی کی خیریت دریافت کی نہ کسی پریشانی کا اظہار کیا۔بس خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

''اف انصر آپ ایسا کیوں کرتے ہیں، اتنی بے حسی۔'' وہ بے بسی سے سوچ کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

''بیٹا! انصر کو رات کی دعوت کی یاد دہانی کروا دو، بلکہ فون ملاؤ میں خود اس سے بات کرتی ہوں۔'' امی نے رات کی دعوت کیلئے انتظام کرتی رابعہ سے کہا وہ اس وقت کچن میں مصروف تھی۔سہ پہر ہو چکی تھی اور اب امی کی طبیعت کافی سنبھل چکی تھی۔شفق سے انہوں نے ابھی فون پر بات کی تھی اور شفق کے کھنکتے لہجے نے ان کو بڑا مطمئن اور مسرور کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ بھی اب کافی بہتر محسوس کر رہی تھیں۔

رابعہ نے خاموشی سے امی کو فون ملا کر دے دیا۔انصر نے امی سے مختصر بات اور جلد ہی امی کو اللہ حافظ کہہ کر فون بند کرنے کی آواز آئی۔اس نے کچن سے جھانکا امی کا چہرہ کچھ اترا ہوا محسوس ہوا۔

''انصر نے معذرت کر لی ہے کہہ رہا تھا کہیں بہت ضروری جانا ہے اس لئے نہیں آ سکتا، میں نے کہا بھی کہ صرف گھنٹہ بھر کیلئے آ جاؤ، ابھی نیا سمدھیانہ ہے لیکن کہہ رہا تھا بہت مجبوری ہے نہیں آ سکتا چلو ٹھیک ہے ہو گا کوئی کام۔'' امی شاید اسی سے یہ سب کہہ رہی تھیں، کچن میں ان کی آواز آ رہی تھی اور رابعہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئی جانتی تھی انصر جان بوجھ کر نہیں آ رہا۔اس نے امی کی بات کا جواب نہ دیا اور خاموشی سے کھانا پکانے میں لگی رہی۔

''ارے رابعہ، میری بچی کچھ مجھے کام دے دو، صبح سے اکیلی لگی ہو۔'' امی کی فکر سے بھرپور آواز آئی۔

''نہیں امی میں کر لوں گی آپ پریشان نہ ہوں، آپ آرام کریں۔''

''صبح سے آرام ہی تو کر رہی ہوں لاؤ فروٹ ہی دے دو، وہ کاٹ دوں'' امی نے کہا تو رابعہ نے خاموشی سے فروٹ کا پیالہ اور چھری امی کے آگے رکھ دی۔

رات کو شفق اپنے شوہر اور ساس وغیرہ کے ساتھ ہنستی مسکراتی آ گئی۔رابعہ اور امی اسے دیکھ کر خوش ہو گئے اس کی ساس بڑی اچھی خاتون تھیں امی تو بہت مطمئن تھیں۔سب نے انصر کی غیر موجودگی کو محسوس کیا لیکن رابعہ نے بڑے مناسب لفظوں میں اس کی غیر حاضری کو

بیان کیا اور یوں بھرم رہ گیا۔

''شکر ہے آپی آپ ابھی ہیں ورنہ مجھے تو امی کی طرف سے اتنی فکر تھی کہ میری تو نیند ہی اڑی ہوئی تھی۔''

چلتے چلتے شفق نے اسے گلے لگتے ہوئے کہا اور رابعہ جواب میں پھیکی ہنسی ہنس دی کیا کہتی اس سب کے لئے اسے کیا کچھ نہیں سہنا پڑ رہا۔

اگلے دن وہ رات کی دعوت کا سارا پھیلاؤ سمیٹ کر ماسی سے صفائی کروا کر گھر جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ اگرچہ امی کی طبیعت ابھی بھی اچھی نہ تھی لیکن اس نے نظریں چرالی تھیں۔ امی بھی رابعہ کے رویے سے کچھ سمجھ گئی تھیں وہ بھی بیٹی کو بلواسطہ یہی کہتی رہیں کہ اب وہ بالکل بھلی چنگی ہیں، اور پھر پڑوسی ہیں۔ دیکھنے والے۔ ویسے بھی دو گلی پیچھے خالہ رہتی تھیں جن کے بیٹے سے بات ہوگئی تھی کہ رات کو وہ آ کر سو جایا کرے گا، یوں رابعہ اپنے دل پر پتھر رکھ کر گھر لوٹ آئی جہاں وہ بے درد رہتا تھا جس سے وہ محبت کرتی تھی۔

☆......☆......☆

انصر گھر آیا تو رابعہ اسے کچن میں مصروف نظر آئی، وہ خاموشی سے اس پر نگاہ ڈالتا ہوا اندر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ انصر کے آنے کا سن کر وہ تیزی سے کمرے کی طرف آئی۔

''السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟ چائے بناؤں؟'' وہ جلدی سے اس کا بیگ ہاتھ میں لیتی ہوئی بولی۔ ''اریبہ بنا دے گی۔'' اس نے مختصر جواب دیا اور الماری سے کپڑے نکالنے کے لئے بڑھا۔

''آپ کے کپڑے میں نے واش روم میں لٹکا دیئے ہیں۔'' وہ جلدی سے بولی اور انصر سر ہلاتا واش روم کی طرف بڑھ گیا تو وہ چائے بنانے کچن کی طرف پلٹ گئی۔ چائے کے دوران اور رات تک انصر نے اس سے کوئی خاص بات نہ کی تھی۔ جب کہ ساس اور نندیں دونوں اس کی خیریت اور امی کے متعلق پوچھتی رہیں لیکن انصر نے ایک دفعہ بھی امی کی خیریت پوچھنا گوارا نہ کی وہ منتظر ہی رہی لیکن مایوس ہو رہی۔ رات کو بچوں کو سلا کر جب وہ بیڈ پر لیٹی تو انصر آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا۔

''انصر آپ مجھ سے ناراض ہیں؟'' رابعہ دھیرے سے بولی۔

''کیوں؟'' وہ اسی طرح بولا۔

''آپ مجھ سے بات جو نہیں کر رہے۔''

''کیا تم کو میری ناراضگی کی پروا ہے؟'' وہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھتے ہوئے بولا ''کیوں نہیں ہے، آپ کی پروا تو سب سے زیادہ ہے، میں تو......''

''بس کرو مجھے نیند آ رہی ہے۔'' اس نے کہہ کر کروٹ بدل لی اور وہ آنکھوں میں آئے آنسو اندر ہی پینے کی کوشش کرتی رہی۔

☆......☆......☆

''کل میرے آفس کے کچھ کولیگ آ رہے ہیں رات میں، ہماری ایک بہت اہم میٹنگ ہے، ڈنر کا بھی میں نے ان سے کہہ دیا ہے، تم تین چار چیزیں اچھی طرح تیار کر لینا۔'' انصر صبح آفس کے لئے تیار ہو رہا تھا، اس نے رک کر رابعہ کی طرف بغیر دیکھے کہا اور آستین کے بٹن لگانے لگا۔

''جی اچھا، کوئی خاص چیز؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، تم خود ہی دیکھ لینا۔'' جانتا تھا وہ کوکنگ بہت اچھی کرتی ہے اور نت نئے پکوان بنانے میں ماہر بھی لہٰذا یہ ذمہ داری بھی اس پر ڈال دی۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ شفق کی شادی کو دو ہفتے گزر چکے تھے لیکن انصر کا موڈ اب تک ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ اس دوران وہ امی کے ہاں صرف دو تین مرتبہ ہی گئی وہ بھی اکیلی صرف گھنٹہ بھر کے لئے تا کہ انصر کو برا نہ لگے۔ لیکن فون وہ دن میں دو مرتبہ تو ضرور کر لیتی اور امی کی خیریت معلوم کر لیتی۔ امی بھی اس کی مجبوری سمجھ رہی تھیں لہٰذا خاموش تھیں۔ خالد روزانہ آ جاتا تھا جس سے رابعہ کو ڈھارس تھی۔ شفق بھی آج کل ہنی مون منانے شہر سے باہر تھی۔

اگلے روز وہ صبح اٹھی تو چکر سے آ رہے تھے، آج طبیعت کافی گری گری تھی۔ کچھ حرارت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اس نے کسی پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا تھا۔ معمول کے مطابق کام نبٹاتی رہی۔ شاہا کو اسکول بھیج کر اور انصر کے آفس جانے کے بعد وہ ساس سے کہہ کر دوبارہ کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ سوچا تھا تھوڑی دیر آرام کرے پھر رات کے لئے دعوت

تیاری بھی کرنی تھی۔ چونکہ دوا کھائی ہوئی تھی لہٰذا نیند بھی آ گئی۔ عون بھی ابھی سو رہا تھا۔ ویسے بھی وہ ذرا دیر سے ہی اٹھتا تھا۔ دادی، پھپھو سے وہ ہلا ہوا بھی تھی۔ گیارہ بج رہے تھے جب وہ ہڑبڑا کر اٹھی طبیعت کافی بہتر تھی وہ جلدی سے کچن میں آ گئی۔ فریزر سے قیمہ اور مرغی نکال کر اس نے پکانے کی تیاری شروع کی۔ ابھی گھنٹہ بھر ہی ہوا تھا کہ خالد کا فون آیا وہ کافی گھبرایا ہوا تھا۔ ''رابعہ باجی، جلدی آیئے خالہ جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر کو لینے جا رہا ہوں، امی کو میں لے آیا ہوں آپ بھی جلدی آ جایئے۔'' خالد کا فون سن کر تو وہ اتنا گھبرائی کہ ہاتھ پاؤں ہی چھوڑ بیٹھی، ساس نے اسے تسلی دی، حوصلہ دیا تو وہ کچھ سنبھلی اور عون کو لے کر فوراً ہی رکشا کر کے ماں کے پاس چلی گئی۔

امی کی طبیعت کافی خراب تھی یہ تو شکر تھا کہ خالد کی انسٹیٹیوٹ کی چھٹی تھی لہٰذا وہ گھر پر ہی تھا اور اس نے فوراً ہی اپنی ماں (رابعہ کی خالہ) کو پہلے بلایا اور پھر ڈاکٹر کو لے آیا۔ ڈاکٹر نے بھی انجکشن لگایا اور پھر ہسپتال لے جانے کا مشورہ دیا رابعہ کے پہنچنے تک امی کو انجکشن لگا دیا گیا تھا اب انہیں قریبی ہسپتال لے جانے کی تیاری تھی۔ شام تک کہیں جا کر امی کی طبیعت سنبھلی اور ڈاکٹر نے گھر جانے کی اجازت دی۔ اس ساری افراتفری میں اسے یاد ہی نہ رہا کہ وہ انصر کو کچھ بتاتی اور جب یاد آیا تو فون ہی انگیج ملا۔ خالد نے شفق کے سسرال بھی اطلاع کر دی تھی۔ شام کو جب رابعہ، امی، خالہ اور خالد کے ساتھ گھر آئی تو اس کا برا حال تھا۔ آج صبح سے وہ خود نڈھال تھی اور پھر یہ صورتحال، ایک شدید ذہنی پریشانی آج اس نے اٹھائی تھی۔ شفق کا فون آ گیا تھا وہ رو رہی تھی۔ رابعہ نے اسے حوصلہ دیا، حالانکہ اسے خود اس وقت کسی کندھے کی شدید طلب تھی۔ خالہ سے اتنی قربت نہ تھی کہ وہ ہمیشہ سے ایک فاصلے پر رہی تھیں۔ زیادہ آنا جانا انہیں شروع سے ہی پسند نہ تھا۔ ابھی بھی شاید بیٹے (خالد) کی وجہ سے بیٹھی تھیں، بار بار انصر کے متعلق پوچھ رہی تھیں کہ وہ انصر کو کیوں نہیں بلا لیتی۔ تب اس نے بتایا کہ انصر کا آفس کا فون مسلسل بزی جا رہا ہے اور اس سے رابطہ ممکن نہیں ہو پا رہا۔ ایسے میں اسے گھر میں دی گئی انصر کی رات کی کھانے کی دعوت کہاں سے یاد رہتی۔ وہ تو امی میں لگ کر سب بھول ہی گئی تھی۔ اور یہ بھول اس کی زندگی کی بہت بڑی بھول ثابت ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

انصر کو آفس سے آتے آتے آج کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی تھی۔ مغرب کی اذانوں کے وقت وہ گھر میں داخل ہوا تھا۔

''رابعہ کہاں ہے امی۔'' اس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھ کر ماں سے سوال کیا۔

''تم سے رابطہ نہیں ہوا، اس کی امی کی تو صبح بہت طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ صبح اس لڑکے کا فون آیا تھا، کیا نام ہے اس کا وہ جوان کے گھر سوتا ہے، رابعہ کی خالہ کا بیٹا۔'' انہوں نے نام یاد کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود رہا۔ ''میں سمجھ رہی تھی کہ رابعہ نے تم سے کہہ دیا ہوگا اور تم وہیں سے اپنی ساس کی خیریت لینے چلے گئے ہوں گے، دیر سے آئے ہو نا، حیرت ہے اس نے تم کو اطلاع نہیں دی۔'' امی تعجب سے کہہ رہی تھیں اور انصر کو تو یہ سب سن کر گویا آگ ہی لگ گئی تھی۔

''مجھے اس نے کوئی فون نہیں کیا اور مجھے پروا بھی نہیں''

میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ ابھی میرے کولیگ آ جائیں گے جن سے میری میٹنگ ہے اور جنہیں میں نے ڈنر کا بھی کہا ہوا ہے، کیا رابعہ رات کی تیاری کر گئی تھی۔'' وہ غصہ میں اب بری طرح جھنجھلا رہا تھا۔

''نہیں تیاری تو کچھ نہیں کی، وہ تو ماں کی طبیعت کا سنتے ہی نکل گئی، اسے موقع ہی کہاں ملا۔''

''اُف کیا کروں میں۔'' غصہ کے مارے وہ مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

''امی آپ اور اریبہ مل کر رات کے کھانے کا کچھ بندوبست کر دیں، کچھ میں بازار سے لے آؤں گا۔'' اس نے ماں سے درخواست کی۔

''میں؟'' امی تو اس اچانک افتاد پر گھبرا گئیں۔

''بس پانچ، چھ لوگوں کا کھانا ہے، مشکل تو نہیں۔''

''تم ایسا کرو ان کو کل بلا لو۔'' امی نے دامن بچایا ''کل تو رابعہ بھی گھر ہوگی۔''

''کل نہیں ہو سکتا، اور اب منع کروں جبکہ دو گھنٹے بعد سب نے آنا

ہے۔''

''تو پھر بازار سے ہی سارا کھانا لے آؤ، اتنی جلدی کچھ نہیں ہو سکتا، اریبہ تو بچی ہے ویسے بھی اس کے پیپر ہونے والے ہیں وہ کہاں کچھ کرائے گی۔'' امی نے تو صاف انکار ہی کر دیا تھا۔

اور انصر کو یہ سن کر اور ہی تپ چڑھ گئی تھی۔ وہ جل بھن کر بازار سے ہی سارا کھانا لے آیا تھا اور تب رابعہ کا فون آیا تھا۔ اس نے ماں کی کیفیت بتا کر رات رکنے کی اجازت چاہی تھی۔ ''جب تک مرضی رکو، مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔'' اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن رابعہ امی کے پاس خالہ کو بٹھا کر گھر آ گئی تھی یہ کہہ کر کہ وہ آٹھ بجے تک واپس آ جائے گی اور رات ماں کے پاس ہی رہے گی اور خالہ کچھ سوچ کر بہن کی حالت کے پیش نظر مان گئی تھیں۔ گھر آ کر وہ کاموں میں مصروف ہو گئی تھی۔ وہ کسی کو اور خاص طور پر انصر کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی لیکن نہیں جانتی تھی کہ تقدیر اس کے ساتھ اب کیسا سنگین مذاق کرنے والی ہے۔

''اوہ تو تمہیں فرصت مل گئی'' آفس سے آ کر انصر نے اسے دیکھ کر پہلا تیر پھینکا تھا۔

''امی کی طبیعت بہت خراب ہے۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی تھی۔

''تو آخر یہ تمہاری بہن کہاں ہے، ساری خدمتوں کے لئے تم ہی رہ گئی ہو۔''

''وہ...... اصل میں...... ہنی مون منانے اسلام آباد، مری وغیرہ'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''اوہ! ایک طرف بڑی بہن کو گھر کی ہوش نہیں ہے تو دوسری بہن سیر سپاٹے کر رہی ہیں۔'' وہ استہزائیہ ہنسا تھا۔

''نہیں نہیں امی کا سنتے ہی وہ تو واپس آنے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ وہ تو اسلام آباد میں موسم کی خرابی کی وجہ سے فلائیٹ کینسل ہو گئیں تو......'' رابعہ نے بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پایا ہوا تھا۔

''ہونہہ، سب بہانے ہیں، تم نے مجھے بے عزت کرانا تھا کل سب کے سامنے، وہ میں ہو گیا۔ تمہیں اتنا نہ ہوا کہ مجھے فون کر کے تو بتا دیتیں میں میٹنگ کینسل ہی کر دیتا۔'' وہ غصہ سے چیخا تھا۔

''میں نے آپ کے آفس کئی فون ملائے تھے لیکن ہر دفعہ ٹیلی فون انگیج جا رہا تھا۔ انصر آپ میرا یقین کریں، میں نے آپ کو کئی......'' آواز بھرا گئی تھی اس سے مزید نہ بولا گیا۔ لیکن انصر کو شاید یقین نہیں آیا تھا۔ تبھی وہ سر جھٹکتا واش روم میں کپڑے بدلنے گھس گیا۔ انصر اتنا بے حس ہو جائے گا، یہ تو رابعہ نے سوچا بھی نہ تھا اور اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ کیسے انصر سے دوبارہ امی کے پاس جانے کی بات کرے۔ انصر کو چائے وغیرہ دے کر صبح کے لئے اس کے کپڑے استری کر کے اور رات کے کھانے کی تیاری کر کے رابعہ نے بڑی ہمت کر کے دوبارہ سے اپنے لہجے میں لجاجت سموتے ہوئے امی کے ہاں جانے کی بات چھیڑی تھی اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے عاجزی سے وہ جھکی جا رہی تھی۔

''یہ میری اجازت کی ضرورت کیوں پڑ گئی تمہیں؟ جب چاہے جاؤ جب چاہے آؤ، میں بھلا کون ہوتا ہوں۔'' وہ تنفر سے کہہ رہا تھا۔

''انصر پلیز دیکھیں میں اس وقت بہت مجبور ہوں، شفق کل تک آ جائے گی تو بس میں......''

''شفق آئے یا نہیں، تم جانا چاہتی ہو تو جاؤ، اب واپس آنے کی ضرورت نہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' اسے لگا کہ اس کا دل بند ہو جائے گا۔

''وہی جو تم سن رہی ہو۔'' وہ سرد لہجے میں تلخی سے بولا تھا۔

''نہیں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔'' رابعہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔

''کیوں نہیں کر سکتا، تمہیں یہاں سے زیادہ اچھا اپنی ماں کا گھر لگتا ہے نا تو ٹھیک ہے جاؤ، وہیں رہو، یہاں کیا رکھا ہے تمہارے لئے۔'' اس نے بے حسی کی جیسے چادر اوڑھ رکھی تھی۔

''آپ جانتے ہیں ایسا کچھ نہیں ہے، یہ سب جھوٹ ہے۔'' اس کے حلق میں جیسے پھندا سا لگ گیا تھا۔

''ہاں میں جھوٹا ہوں، پاگل ہوں، دماغ خراب ہے میرا اس لئے یہ

سب کہہ رہا ہوں، بس میں اب کچھ نہیں سننا چاہتا، چلی جاؤ یہاں سے ابھی اسی وقت......'' انصر غصہ سے پاگل ہی تو ہو گیا تھا اسے شاید خود کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

''انصر، آپ شاید اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں۔'' اب رابعہ کو بھی غصہ آچکا تھا۔

''ہاں، نہیں ہوں حواسوں میں، آؤٹ۔''

''انصر، انصر ہوش میں آؤ، کیا الٹا سیدھا بول رہے ہو۔'' شور سن کر امی اور اریبہ بھی کمرے میں آچکی تھیں۔ امی انصر کا غصہ ٹھنڈا کر رہی تھیں۔

''غصہ تھوکو اور خاموش ہو جاؤ۔''

''امی آپ برائے مہربانی یہاں سے چلی جائیں۔ اور تم گئی نہیں'' وہ پھر غرایا۔

''ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں۔'' ہونٹ بھینچتے ہوئے وہ آنسو پوچھتی ہوئی بولی۔ ''اب آپ اگر لینے آئیں گے تو بھی نہیں آؤں گی۔''

''ہونہہ، جاؤ میں لینے نہیں آؤں گا۔''

''اور میں بھی واپس آنے کے لئے نہیں جا رہی، انصر آپ سن لیں اگر آپ آئیں گے......''

''کسی خوش فہمی میں نہ رہنا، میں کبھی نہیں آؤں گا۔'' انصر، رابعہ کی بات کاٹتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مضبوطی سے یوں بولا کہ رابعہ کا لمحہ بھر کے لئے تو دل دھڑکنا ہی بھول گیا تھا بات معمولی تھی مگر اس کو غیر معمولی ان دونوں کے رویوں نے بنا دیا تھا۔ امی اور اریبہ بت بنی یہ سب دیکھتی رہ گئیں اور رابعہ دونوں بچوں کو لے کر اپنا مختصر سا سامان اٹھا کر گھر سے چلی گئی تھی۔

''انصر بیٹا، بس اب غصہ اور ناراضگی ختم کرو اور رابعہ اور بچوں کو گھر لاؤ، دیکھو تو گھر کتنا سونا پڑا ہے۔'' ایک ہفتہ کے بعد امی نے انصر سے کہا تھا۔ لیکن انصر نے کوئی جواب نہ دیا تھا اور اس طرح وقتاً فوقتاً امی نے کتنی ہی مرتبہ انصر سے کہا، کتنا ہی سر پٹخا لیکن وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔ دوسری طرف امی نے بہو رابعہ کو بھی کئی دفعہ فون کر کے گھر آنے کے لئے کہا تھا لیکن اس نے بھی صاف انکار کر دیا تھا۔

''امی انصر نے مجھے گھر سے نکالا ہے، جب تک وہ مجھے خود آنے کا نہیں کہیں گے میں نہیں آؤں گی۔''

ہر دفعہ رابعہ کا جواب بھی یہی ہوتا تھا اور یوں وقت اپنے پھیلائے خوشیوں اور غموں کو ساتھ لئے گزرتا چلا گیا۔ پانچ سال گزر گئے تھے۔ امی نے تھک ہار کر کہنا چھوڑ دیا تھا۔ اریبہ کی بھی اس دوران شادی ہو گئی تھی۔ گھر میں رافعہ اور امی ہوتی تھیں۔ انصر کا اپنا روٹین تھا۔ خاموش اور مصروف۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنے آپ کو بے حد مصروف کر لیا تھا اتنا کہ گھر آکر بھی وہ آفس کا کام ہی کرتا رہتا۔

☆......☆......☆

''ہیلو، السلام علیکم۔'' اجنبی سی آواز تھی ''انصر بول رہے ہیں؟'' کوئی پوچھ رہا تھا۔

''وعلیکم السلام، معاف کیجئے میں پہچانا نہیں۔'' انصر اپنے سیل فون پر اس آواز کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''ارے کمینے مجھے نہیں پہچانا'' اب انتہائی بے تکلفی سے کہا گیا تھا۔

''ارے سہیل تم، زندہ ہو؟'' فرط مسرت سے انصر نے نیم مزاحیہ انداز میں کہا۔

''زندہ بھی ہوں اور تمہارے شہر میں بھی۔'' دوسری طرف سے سہیل کی آواز بھی بھرپور تھی۔

''اتنے سالوں بعد؟ تم کب آئے؟ کہاں ہو؟ تمہیں میرا نمبر کہاں سے ملا؟'' انصر نے پے در پے سوال کر ڈالے تھے۔

''سڑک سے ملا، ارے بے وقوف راشد سے لیا ہے۔'' اس نے ایک مشترکہ دوست کا نام لیا۔

''ابھی چند دن پہلے ہی ملک آیا ہوں تقریباً پانچ سال بعد، پانچ سال پہلے جب آیا تھا جب بھی میں نے تم سے ملنا چاہا لیکن اتفاق سے جب تم آفس کے کسی کام سے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے یوں ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ آج کل بڑے بھائی جان کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں، بس یار زندگی اتنی مصروف ہو گئی ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی اب بھی کب سے

پروگرام بنایا ہوا تھا یوں بچوں نے کہ پاکستان چلیں گے اب آنا ہوا، اچھا تم سناؤ کیسے ہو، تمہاری والدہ، بیوی بچے سب کیسے ہیں؟'' سہیل نے اپنے حالات سنا کر اس سے تفصیل جاننا چاہی اور جواب میں انصر گڑبڑا کر رہ گیا۔ کیا بتاتا کہ ایک زمانہ ہوا، بیوی، بچے اس کی زندگی سے نکل گئے ہیں۔ سہیل اس کا اسکول، کالج کا بہترین دوست تھا۔ لیکن پھر گردش دوراں نے دونوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ اگلے ہی دن انصر سہیل سے ملنے چلا آیا دونوں خوب گرم جوشی سے ملے۔ اس کے بیوی بچے بھی انصر سے تپاک سے ملے۔

''ماشاءاللہ کتنے بڑے ہوگئے تمہارے بچے'' انصر مسکرا کر بولا۔

''ہاں یار، عباد تو میرے قد کے برابر ہی آ گیا۔ تم سناؤ تمہارے بچے کیسے ہیں، کچھ فیملی میں اضافہ ہوا یا وہی دو بچے خوشحال گھرانہ پر عمل پیرا ہو، شاہا تو بڑی ساری ہوگئی ہوگی۔ کس گریڈ میں ہے؟'' سہیل ہنسا۔

جواب میں انصر اسے ٹال کر دوسرے موضوع پر لے آیا، دونوں دوست فرصت سے بیٹھے ایک دوسرے سے زندگی کے اتار چڑھاؤ پر اظہار کر رہے تھے۔ ایک عرصہ بعد انصر کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زندگی اور اس کی رنگینیوں کو محسوس کر رہا ہے۔ رات تک وہ وہیں بیٹھا رہا۔ کھانا بھی اس نے سہیل کی فیملی کے ساتھ کھایا۔

''انصر بھائی آپ بھی کل چلیں ہمارے ساتھ، ہم سب کل ساحل سمندر پر جا رہے ہیں۔'' سہیل کی بیوی نے انصر سے کہا۔

''ہاں یار، تم بھی کل چلو، بھائی جان کی اور میری بہن شمع کی فیملی بھی ہے، سب صبح سویرے ہی نکلیں گے بس کل تم سات بجے آجانا ہمارا ساڑھے سات تک نکلنے کا ارادہ ہے۔'' انصر سے پہلے سہیل نے بھی بیوی کی تائید کی۔

''لیکن یار کل صبح آفس ہے، مجھے بہت کام......''

''بس بس مجھے پتہ ہے آفس اور کام کا یار کبھی کبھی تفریح بھی ضروری ہے، بس کل تم آ رہے ہو، اب کوئی ایکسکیوز نہیں سنوں گا میں۔'' سہیل نے انصر کی بات کاٹتے ہوئے قطعی انداز میں کہا اور سہیل کو اس کی بات ماننی ہی پڑی۔ لیکن بیوی بچوں کی طرف سے اس نے معذرت کر لی بھی کہ ان کے متعلق ٹیسٹ ہو رہے ہیں وہ نہیں آسکتے۔

☆......☆......☆

اگلے دن سہیل کی فیملی کے ساتھ انصر پکنک پر چلا آیا۔ سب کو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے دیکھ کر اس کو پہلی مرتبہ اپنی زندگی کے خالی پن کا احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا سہیل کے ساتھ لہروں سے کھیلتے اس نے سہیل سے کافی بے تکلفی سے اس کی گھریلو زندگی کے بارے میں سوالات کئے سہیل نے بھی بغیر کسی لاگ لپیٹ کے ایمانداری سے جواب دیئے۔

''یار ایک زمانہ میں تم کہتے تھے تمہاری بیوی بڑی زبان دراز اور کچھ گھر سے بھی بیزار رہنے لگی ہے۔'' انصر نے کچھ جھجکتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ ''اپنی مرضی چلاتی ہے؟''

''ہاں یار ایسا بھی دور آیا تھا، لیکن اب دیکھو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ اگرچہ اب بھی وہ کوئی ایسی نیک پروین ٹائپ چیز نہیں ہوئی لیکن پہلے سے بہت بہتر ہے۔ بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو بہت کچھ میاں بیوی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یار زندگی میں سمجھوتے اور قربانی، یہ دو بڑی چیزیں ہیں۔ اس کے بغیر آپ کا گھر بن ہی نہیں سکتا۔ صبر، برداشت، ایک دوسرے سے محبت کا برتاؤ، میں نے جب ان چیزوں کو سمجھا اور سندس کے ساتھ بہت سی باتوں میں سمجھوتہ کیا اور اپنے گھر کے لئے بہت سی ناگوار باتوں کو درگزر کیا تو یار حیرت انگیز طور پر میرے گھر کے بہت سے مسائل کم ہوگئے اور پھر میرے رویے کو دیکھتے ہوئے سندس میں بھی بڑی خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی اور آج تم دیکھ ہی رہے ہو اگرچہ کوئی آئیڈیل زندگی تو نہیں کہتا میں لیکن پھر بھی بہت سوں سے بہتر ہے۔ محبت دو گے تو محبت ضرور ملے گی، یہ میرا فلسفہ ہے اب تم اسے جو چاہے کہو۔'' وہ جھک کر پانی سے بڑی خوبصورت سیپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

''پپا، پپا آجائیں ممی کہہ رہی ہیں کھانا کھا لیں۔'' سہیل کے چھوٹے بیٹے نے ساحل پر سے آواز لگائی تو دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ہاتھ ہلا رہا تھا۔ سہیل نے بھی جواب میں ہاتھ ہلایا اور دونوں نے واپسی کے لئے قدم بڑھائے۔

☆......☆......☆

سہیل اور اس کی فیملی کے ساتھ ایک خوبصورت لیکن تھکا دینے والے دن کے اختتام پر جب وہ گھر آیا تو تہی دامنی کا شدید احساس اور اپنی غلطیوں اور بے جا ضد کے پیچھے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کو خوشیوں سے محروم کر لینے کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ وہ ساری رات جاگتا رہا اور سود و زیاں کا حساب کتاب کرتا رہا۔ ان گیارہ سالوں میں اس نے کیا کھویا کیا پایا، صبح فجر کی اذانوں کے وقت اس کی آنکھ لگی تھی۔ گیارہ بجے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ اٹھا نہا دھو کر فریش ہو کر اس نے ناشتہ کیا اور اخبار دیکھنے لگا آفس جانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ دوپہر کے ڈیڑھ بج رہے تھے جب اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی۔ اب اس کا رخ شہر کی اس مصروف سڑک پر تھا جہاں دو تین اسکول تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تھے۔ اس نے ایک اسکول کے آگے گاڑی روک لی تھی اور اسکول کی چھٹی ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ گھنٹی بجتے ہی بچوں کا ایک جم غفیر تھا جو اسکول کے گیٹ سے نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد کافی حد تک سناٹا ہو گیا تھا۔ اب ٹیچرز نکل رہی تھیں اور انہی میں رابعہ بھی تھی۔ اس نے کافی عرصے پہلے شاہا اور عون کے اسکول میں ہی بحیثیت ٹیچر کے ملازمت اختیار کر لی تھی۔ رابعہ کے دائیں بائیں شاہا اور عون تھے۔ انصر کے قدم تینوں کو دیکھ کر جم سے گئے تھے۔ ایک عجیب سی کیفیت اس پر طاری تھی اور اس سے پہلے وہ سڑک پار کرتے انصر تیزی سے آگے بڑھا تھا۔

''رابعہ'' اس کے منہ سے سسکتی سی آواز نکلی۔ اپنا نام سن کر رابعہ نے تیزی سے گردن گھمائی تھی اور جیسے اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔

''گھر چلو، میں تمہیں لینے آیا ہوں۔'' انصر نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے صاف آواز میں کہا۔

کتنے ہی پل گزر گئے۔ رابعہ ایک ٹک انصر کو دیکھ رہی تھی۔ یقین اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔

''ماما'' عون نے اس کا کندھا ہلایا۔ دونوں دائیں بائیں کھڑے اس ناقابل یقین صورتحال کو دیکھ رہے تھے اور کچھ پریشان بھی تھے۔

''آں ہاں'' وہ چونکی اس اثناء میں انصر نے گاڑی کا دروازہ اس کے لئے کھول دیا تھا۔

''چلو بیٹا، گاڑی میں بیٹھو، ہم اپنے گھر چل رہے ہیں۔'' وہ آسودگی سے بولی اور اپنا پرس سنبھالتی گاڑی میں بیٹھنے لگی۔

☆......☆......☆

سفرشناس

بس یہ شروع کے دو چار ایام ہی تھے جب عاتکہ نئے رشتہ کے حوالے سے مضطرب نہ تھی ورنہ اس کے بعد ہر دن میاں پر نظر ڈالتے ہوئے اسے شوہر کے چہرے پر جیکی کی پرچھائیاں نظر آتیں حالانکہ مجال ہے جو سراج نے کبھی کسی بھی لمحہ عاتکہ کو جیکی کے حوالے سے اپنی چاہت سے آگاہ کیا ہو یا اس کے حقوق میں کوتاہی کی۔ ہاں دل بلاشبہ اس کا جیکولین کے ساتھ تھا۔ وہ ایک نرم خو بیٹا تھا تو نرم خو شوہر بھی تھا۔ اسے پورا احساس تھا کہ عاتکہ ایک عمدہ شریک حیات ہے۔ لیکن پھر بھی دل کہتا تھا جیکی جیسی کوئی نہیں!'' جس طرح جیکولین نے اس کو اپنے خاندان میں رنجشیں اور دراڑیں ڈالنے سے روکا اور مدد کی اس نے سراج کو مزید اس کا طلبگار کر دیا۔ ''کون عورت ایسا کرے گی؟'' سراج اکثر جیکولین کے بارے میں اپنی شادی کے حوالے سے سوچتا۔ ''کون اپنی محبت کسی کو ایسے دان کرتا ہے؟'' وہ سوچتا اور جیکی اس کے حواسوں پر مزید چھا جاتی۔

شادی کے بعد اسے عاتکہ سے بھی محبت ہو چکی تھی مگر اس کا رنگ جدا تھا۔ وہ محبت ضرور بیوی سے کرتا تھا لیکن سوال جواب اس کی ذاتیات کے بارے میں اس کو برداشت نہ تھے۔ سپاٹ چہرے کے ساتھ وہ عاتکہ کے ہر اس سوال پر خاموش ہو جاتا جس میں جیکولین کا کسی بھی حوالہ سے ذکر ہوتا اور ایک آدھ بار اس نے اتنی انگارہ آنکھوں سے نگاہ عاتکہ پر ڈالی کہ اس کو یقین ہی نہ آیا کہ یہ لمحہ بھر پہلے کا مسکراتا ہوا سراج مغل ہے جس نے اس کے ہاتھ میں ڈائمنڈ کے آویزے پکڑاتے ہوئے اسے سالگرہ وش کی ہے۔ ابھی تو سرخ مخملی ڈبیہ اس کے ہاتھ ہی میں تھی اور بس اس نے محض اتنا پوچھا تھا کہ کیا جیکولین بھی اسی آؤٹ لیٹ سے خریداری کرتی ہے؟'' سوال بے شک چبھتا ہوا نہ تھا لیکن سراج مغل اس کے پیچھے چھپی عاتکہ کی کیفیت جان چکا تھا۔ ''محبت اور ملکیت میں شراکت کا خیال ہے اس کو محض!'' اس نے غصہ کو دباتے ہوئے محض نگاہ بھر دیکھنے پر ہی اکتفا کیا اور عاتکہ کو پیغام مل گیا کہ عاتکہ کی حدود کہاں سے کہاں تک ہیں۔

اس کی اکیسویں سالگرہ شادی کے دو ماہ بعد آ گئی تھی اور بس دو ماہ بعد ہی اسے اپنی آخری حد کا اندازہ جیکولین کے حوالے سے ہو چکا تھا۔ نکاح نامے پر دستخط بے شک سراج اور عاتکہ کے تھے لیکن محبت نامے جو جیکی کے لئے اس کے میاں کی آنکھوں میں ابھرتے تھے وہ بیوی نے اپنے لئے نہ دیکھے تھے کبھی کبھی عاتکہ آئینہ میں ابھرتے اپنے عکس کو بغور دیکھتی کہ کیا واقعی یہ سراپا اس قابل نہیں کہ اس کو کوئی مرد محبوب بیوی بناتا۔ پہلے منگنی ختم ہوئی۔ وہ بھی دنیا کے لحاظ سے عمدہ ترین رشتہ تھا۔ پھر جس کے نکاح میں آئی، وہ اس سے کہیں بڑھ کر قابل رشک، لیکن اس کے باوجود دونوں بار وہ من چڑھی ایسی نہ بنی کہ اس کے لیے یہ کہا جاتا کہ ''تم جیسا کوئی نہیں'' وجود میں ایسا سحر نہ تھا جو اس کو اولین درجہ پر لے آتا۔ یہ سوچ اس کو روہانسا کر دیتی۔ مگر اس کے باوجود اس کے لئے سراج مغل ساحر بن چکا تھا وہ اس کی قابلیتوں اور خوبیوں سے ہمیشہ آگاہ تھی کہ خالہ کے گھر میں ہمیشہ ہی سے ذکر ہوتا رہتا تھا۔ سراج کے دونوں بڑے بھائی عرصے سے امریکہ میں تھے۔ سو خالہ کی زبان پر سراج کا ہی نام رہتا۔

بیوی بنتے ہی سراج مغل کے لئے وہ ایک عمدہ ترین نعمت تھی۔ محبت کا ٹھنڈا میٹھا چشمہ جو نرمی سے بہتا بے آواز سیراب کرتا چلا جاتا ہو جبکہ جیکولین ایسا آبشار تھی جو بلندی سے پوری رفتار اور آواز کے ساتھ گرتا ہو کہ اس سے اڑنے والی پانی کی پھوار دوسروں کو بھی ٹھٹکا دے۔ سراج مغل کو بلاشبہ جیکی زیادہ اپنی طرف کھینچتی تھی۔

پھر زندگی نے ایک نیا موڑ لیا اور گل گوتھنی سی فاطمہ آ گئی۔ باپ

بنتے ہی جیسے سراج مغل کی ساری کائنات اپنی بیٹی میں سمٹنے لگی۔ جیکی کی حسیات چوکنا ہونی شروع ہو گئیں اور اس نے ایک بہترین داؤ کھیلا۔ وہ سراج کی فطرت خاصا جانتی تھی سو اس نے کسی بھی جذباتی گفتگو کی بجائے ایک شام بھاپ اڑاتی کافی کا مگ اس کے سامنے رکھتے ہوئے سرسری سے انداز میں یہ اطلاع دی کہ وہ منصور شاہ سے تین دن بعد شادی کر رہی ہے۔ کافی مگ ہونٹوں سے لگاتے سراج نے بہ مشکل گھونٹ بھرا اور کسی تاثر کا اظہار کئے بغیر جیکی کو دیکھنے لگا۔ گہرے نیلے سوتی مغربی انداز کی جیکٹ نما شرٹ اور پینٹ میں وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ اخروٹی بالوں کا خوبصورت جوڑا اس کی گردن کی خوبصورتی کو نمایاں کر رہا تھا۔ گلے میں جھولتا J کا پینڈنٹ نہ جانے جیسس (Jeaus) کے لئے تھا یا جیکولین کے لئے۔ جب بھی سراج نے اس سے یہ سوال کیا تو وہ بس مسکرا گئی۔ ''جیکولین جیسس کے طفیل ہی تو ہے'' یہ بس اس نے ایک بار بہت ہی دھیمے سے کہا تھا جو نہ جانے سراج مغل نے سنا بھی تھا کہ نہیں۔ سراج مغل کو کبھی اس سوال کی گہرائی ناپنے کی فرصت بھی نہ تھی۔ وہ تو بس زندگی کی کامیابیاں برستی بارش کی طرح سمیٹ رہا تھا۔ اب جو جیکی نے منصور شاہ سے شادی کی اطلاع دی تو جیسے کچھ عرصے سے سویا ہوا جذباتی ریلا پوری قوت سے جاگ اٹھا۔

''تین دن بعد منصور شاہ سے شادی کے بجائے سراج مغل سے بھی شادی کی جا سکتی ہے اگر تم چاہو۔''

کافی سے بھاپ نکلنی بند ہو چکی تھی اور وہ صرف اس وقت تک گھونٹ بھرتا تھا جب تک بھاپ اس کو چہرے پر ٹکراتی محسوس ہو۔ جیکی سے اپنی والہانہ خوشی کو بمشکل ہی نارمل رکھا۔ لیونڈر کی مسحور کن دھیمی لطیف خوشبو میں سراج کا پسندیدہ ڈریس اسٹائل اور رنگ پہنے وہ پور پور سے خوش ہو چکی تھی۔ جذبات پر کنٹرول میں وہ ماہر تھی۔ تاثرات چھپانے میں بھی کمال تھا۔

سراج مغل کو بھی یہ مہارتیں تھیں مگر زندگی کے دو تین مقامات ایسے تھے جہاں یہ مہارت کام کرنا بند کر دیتی تھی۔ پہلے اور واضح ترین اصل تاثرات اس کے اپنی ماں کے ساتھ ہوتے تھے۔ انتہائی والہانہ اور شدید محبت ماں سے کرتا سراج مغل ہمیشہ وہ چھوٹا سا بچہ لگتا جس کو ماں کے بنا دنیا غیر محفوظ لگتی ہو۔ دوسرا مقام بھی ایک عورت ہی کا تھا اور وہ تھی جیکولین، وہ خالص تاثرات کے ساتھ اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ تیسرا مقام وہ تھا جب اس نے فاطمہ کو اپنی بانہوں میں بھر کر چوما تھا۔

''اتنا خوبصورت اور قیمتی تحفہ دینے پر تمہارا مجھ سے کیا تحفہ لینے کو دل چاہتا ہے؟''

اس نے عاتکہ کو لگاوٹ سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس کے تھکے ماندے وجود سے ٹیس سی اٹھ گئی۔ چند گھنٹوں قبل ہی تو وہ درد کے اتھاہ سمندر سے گزر کر اس مقام تک آئی تھی جہاں پہلی بار سراج کی آنکھوں نے وہ لو دی تھی جو اس نے آج تک اپنے لئے اس کی آنکھوں میں چمکتی نہ دیکھی تھی۔ کتنی خوش نصیب ہے فاطمہ!'' بے اختیار اس نے سوچا اور اسی لمحہ اس سے ملنے آنے والے اس کے اپنے باپ نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ ''زرد ہو رہی ہو عاتکہ، کچھ خون مانگ لو سراج سے۔'' خوش مزاجی سے کہتے ہوئے وہ فوراً ہی داماد کی جانب متوجہ ہو گئے، جو عارف صاحب کی بات پر بے اختیار کھل کے ہنس دیا۔

اس وقت بھی جیکی کی بات سے اس کے اندر سخت بے چینی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ''منصور شاہ میرا حریف!'' اس نے منصور شاہ کے لئے دل میں شدید غصہ محسوس کیا اور ایک بے اختیار گہری سانس بھر کر جیکی کو بازو سے کھینچتا ہوا اس کے فلیٹ سے باہر نکل آیا۔ یہ فلیٹ اس نے ہی جیکی کو پچھلے برس خرید کر دیا تھا۔ پوش علاقے کا یہ فلیٹ جیکولین کے نام نہ تھا لیکن ایک چھوٹی سی کیل سے لے کر مغلیہ انداز کے سے فانوس تک ہر شے سراج مغل نے مہیا کر کے دی تھی۔ آرٹسٹک ٹچ کی عمارت میں گراں ترین قیمت کے اس فلیٹ کی ہر کھڑکی سے نظر آتا نظارہ اتنا دلکش اور سرسبز تھا کہ سراج مغل کو ٹیرس پر رکھی خوبصورت کین کی کرسی پر بیٹھ کر جیکی کے ساتھ کافی پینا بے حد مرغوب تھا۔ عمارت کے چہار اطراف میں سبزہ تھا جس میں لگے درخت اور پھلواری سے اٹھتی باس دل و دماغ میں سکون سا اتارتی تھی۔ عمارت کے مکین شہر کے وہ لوگ تھے جن کی جسمانی ساخت ہی عمومی لوگوں سے مختلف نہ تھی بلکہ حرکات و سکنات بھی حاکمانہ انداز والی

تھیں۔ یہ کسی نہ کسی بااثر عہدے پر گرفت رکھ کر کثیر آبادی پر اپنا حکم بزور طاقت نافذ کرنے والے طبقہ میں سے تھے۔ جیکولین کے فلور پر سوئس ائرلائن کا کیٹرنگ منیجر بھی تھا اور محکمہ جنگلات کا اعلیٰ ترین افسر بھی۔ منصور شاہ کا فلیٹ بھی پچھلے برس تک اس عمارت میں تھا۔ خود وہ اکثر وقت پاکستان میں گزارتا جب کہ فیملی اس کی ناروے میں برسوں سے مقیم تھی۔ سیاست کے منجھے ہوئے کھلاڑی کا بیٹا تھا۔ لوگ اسے بادشاہ گر بھی کہتے تھے۔ سراج مغل کو اگر جیکی کے معاملے میں کوئی رقیب کبھی لگا تھا تو وہ باوقار سی وضع قطع کا مالک منصور شاہ ہی لگا اور آج جیکی نے جیسے ہی اس کا نام لیا تو سراج کے اندر الارم پوری قوت سے بجنے لگے۔

جیکی بھی خوب آرام سے موم کی گڑیا کی طرح کھنچتی چلی گئی اور محض دو گھنٹہ کے اندر وہ سراج مغل کے نکاح میں آچکی تھی۔ سراج مغل کے اختیارات کی حد میں یہ سب کرنا آدھے گھنٹہ میں بھی ممکن تھا لیکن سب سے پہلے عروسی جوڑے کے نام پر فوری طور پر کچھ خریداری کی گئی اور پھر یہ سب اتنے آناً فاناً ہوتا چلا گیا کہ جیکولین بھی کچھ وقت کے لئے سن سی ہوگئی۔ ''یہ سب کچھ کیا ٹھیک ہوا؟'' نکاح کے دوران سراج مغل نے ''جی امی!'' کہہ کر فون رسیو کیا تو اس کے چہرے کا رنگ لحہ بھر کو تبدیل ہو گیا تھا اور اس سمے پہلی بار جیکولین کو لگا کہ اب اس کی زندگی میں رسہ کشی کے کھیل کا آغاز ہو چکا ہے، جہاں ایک سرے پر وہ اور دوسرے پر سراج کی ماں اور اس کی بیٹی ہیں، بہت ہی طاقتور حریف! عاتکہ کو کبھی اس نے بطور حریف سمجھا ہی نہیں تھا۔ اسے سراج مغل کے لمبے چوڑے وجود پر عاتکہ کی حکمرانی کے ادنیٰ آثار بھی کبھی محسوس نہ ہوئے تھے جب کہ اس کی اپنی کتنی عادتیں اور پسند سراج کی عادتوں اور پسند میں ایسے ڈھلتی چلی گئی تھیں جیسے اسفنج نرمی سے پانی جذب کر لے۔ پورا کا پورا سارے کا سارا۔

آئس ٹی سراج کو کبھی مرغوب نہ تھی لیکن جیکولین کی پسند تھی تو مدت ہوئی سراج کی بھی بن گئی۔ سفید رنگ جیکی اکثر پسند کرتی تو سراج نے اپنے گھر میں کتنے ہی پھول سفید رنگ کے لگوا دیئے۔ عاتکہ کے ساتھ صبح ہوتی بھی تو وہ کھڑکی سے باہر نظر آتے سفید پھولوں کو دیکھ کر مسکرا دیتا۔ اب سفید ہی جوڑے میں ملبوس جیکولین اس کی پوری طرح ہو چکی تھی۔ زندگی ایک دم سے اسے بے انتہا حسین لگی۔ سراج مغل کچھ وقت کے لئے ہر چیز فراموش کر کے اس خمار میں ڈوب جانا چاہتا تھا جو جیکی کو اپناتے ہی اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگا تھا۔ ''کیا دنیا اتنی ہی خوبصورت ہے یا یہ احساسات کا کمال ہے۔'' وقت جیکی کے ساتھ گزارتے یہ سوچ سراج کے ذہن میں ابھری اور وہ مسکرا کر قوس وقزح سے بھرے لمحات میں کھو گیا۔

فاطمہ نے بھی اپنی ماں عاتکہ کی طرح محض چار دن ہی دنیا میں جیکولین کے اثرات کے بنا گزارے اور پھر پانچویں دن ہی سراج مغل کی زندگی میں جیکی آچکی تھی۔ عاتکہ سے شادی کے دو سال بعد فاطمہ اور فاطمہ کی پیدائش کے پانچویں دن جیکی سراج مغل کی زندگی کی ناگزیر حد بن چکی تھی۔ دو نہایت طاقتور مقناطیس تھے جن کے درمیان سراج مغل آچکا تھا۔ فاطمہ اس پر دباؤ نہ ڈال سکتی تھی لیکن قدرت کی ودیعت کردہ محبت کی لہریں اس طرح ایک باپ کے دل میں موجزن کر دی جاتی ہیں کہ وہ چاہے بچے کی ماں سے تعلق نہ بھی رکھنا چاہے لیکن اپنے خون کی کشش اسے اپنی اولاد کے گرد طواف کرا دیتی ہے۔ سراج مغل یقیناً عمومی باپ کی طرح کے سے انداز نہ رکھتا تھا لیکن فاطمہ سے اس کا لگاؤ عاتکہ کے دل میں کافی ٹھنڈ سی اتار دیتا۔ اس کی پیدائش پر اس نے اپنے نئے شروع ہونے والے پروجیکٹ کا نام ''عاتکہ'' رکھا تھا جو ساحل سمندر پر پرآسائش ہٹ تھے۔ جس کے سارے شیئر ماں بیٹی کے نام تھے۔ سراج مغل کے محبت کے انداز ایسے تھے جو اس کے مادی وسائل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ فاطمہ کو بانہوں میں لحہ بھر کو بھرتا، چومتا اور بس۔ اس کی زندگی میں مصروفیات کا انبار لامتناہی تھا اور اس لامتناہی انبار تلے اس کے اختیارات اور دولت کا حجم پھیلتا تھا۔

جیکولین سے تعلق بنتے ہی عاتکہ کو ملنے والا وقت مزید سمٹ گیا۔ سراج مغل کی بیرون ملک مصروفیات بڑھ گئیں، نت نئے کاروبار نئے علاقوں میں جمائے گئے، جن کی دیکھ بھال کے لئے وہ کبھی کہیں تو کبھی کہیں ہوتا، جیکولین کا اس کے ساتھ جانا کوئی نئی بات تو کبھی نہ تھی، لیکن استحقاق کے سے انداز جیکولین کی نگاہوں میں سراج کے لئے دنیا کو اب

واضح نظر آتے تھے۔ عاتکہ بے بسی سے یہ سب دیکھتی جاتی۔ کس بات کی شکایت کرتی اور کس بات کا شکوہ، اسے خوب اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کا شوہر اس کی تمام تر ضروریات اور آسائش کا بے انتہا خیال رکھ کر اس کو ابتدا ہی میں یہ جتا چکا تھا کہ جیکولین کے معاملہ میں عاتکہ کی حد بندی کس درجہ پر ہے۔ وہ بہت خیال رکھنے والا شوہر تھا بس دل کی ملکہ وہ نہ بن سکی تھی جس میں نہ عاتکہ کا قصور تھا اور نہ سراج کا۔ اس نے جیکولین کے علاوہ کسی کی بھی شراکت داری اپنی زندگی میں برداشت نہ کرنا چاہی تھی۔ عاتکہ کو لانے کی خواہش اس کی ماں کی آنکھوں میں لہریں دینے لگی تھی۔ وہ ان کو بھی نظر انداز کر ہی دیتا کیونکہ کسی کی بھی زندگی وہ لمحاتی جذباتی فیصلہ کی نذر نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کائنات میں نافذ ہونے والے احکامات میں سے ایک عاتکہ اور سراج کا رشتہ ہونا بھی تھا جس کا ذریعہ جیکولین بنی اور وہ اس کی دلیل کے آگے خاموش ہو گیا۔ نہایت ہی عجوبہ بات تھی لیکن پوری ہونا تھی تو جیکی کے ذریعے...... نسرین مغل کی سراج کی نیک صالح نسل کے لئے مانگی گئی دعائیں عاتکہ جیسی سلجھی ہوئی بہو کے ساتھ پوری کرا دی گئیں۔

خبر اخبار میں بے شک نہ چھپی لیکن سراج کے گھر تک پہنچ ہی گئی۔ عاتکہ نے ڈبڈباتی ہوئی نظروں سے ساس کو دیکھا جنہوں نے لمحہ بھر قبل ہی اس کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب بٹھا کر یہ خبر سنائی تھی۔ سراج نے ماں کو اطلاع دینے کی ہمت کرنے کی بجائے باپ کو خود بتا دیا تھا کہ وہ کیا قدم اٹھا چکا ہے۔ منیر مغل کے لئے یہ اطلاع خوشکن تو نہ تھی لیکن روح فرسا بھی نہ تھی۔ ''اس سے پہلے کوئی اس کو ایشو بنا کر ہمیں الجھائے ہم کو خود اس معاملہ کو گرفت میں رکھنا ہوگا۔ بیوی کو ہموار لہجے میں بتاتے ہوئے انہوں نے اس جملہ کو مضبوطی سے ادا کیا۔ ''شادی ہی کی ہے سراج نے، کوئی گرل فرینڈ کا معاملہ نہیں جو ہماری نیک نامی پر اثر آئے۔ نہ اس کو مشہور کرو اور نہ تردید۔ ایسے جواب تیار رکھو کہ دنیا خود ہی خاموش ہو کر جو چاہے سوچتی رہے، ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''منیر مغل کی آواز میں چٹان کی سی قوت تھی۔ بیٹے کے نکاح نے انہیں چونکایا ضرور تھا لیکن ہلایا نہیں تھا۔ عجیب احمق لوگ ہیں سمجھتے ہیں ایک شادی ہوتے ہی مرد کی حسیات کام کرنا بند کر دیتی ہیں اور وہ بھی ایسے معاشرے میں جہاں ہر وقت انواع اقسام کے نظارے میسر ہوں۔ یہ تو سراج کی خوبی ہے کہ وہ ادھر ادھر دوستیاں رکھنے کے بجائے صاف ستھرا کام کر چکا ہے۔'' منیر صاحب لگتا تھا دبی ہوئی کوئی سرگوشی بیٹے کے خلاف سن کر ناگواری سے بھر چکے تھے۔

نسرین مغل نے بے اختیار اپنے ہینڈسم سے شوہر کو دیکھا جو ڈھلتی عمر کے باوجود پوری طرح مستعد تھے، ''اگر یہ خیالات ان کے ہیں تو ایسا تو کبھی میرے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔'' یخ سی لہر ان کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی تھی۔ ''حلال حلال ہے، کسی کے کہنے اور خواہش پر اسکو رد نہیں کیا جا سکتا۔''

منیر مغل کا کچھ لمحوں بعد پھر جملہ ابھرا تو وہ بے اختیار گہرا سانس لے کر عاتکہ کے پورشن کی جانب بڑھ گئی تھیں۔ سراج اور ان کے والدین کے رہائشی حصہ کے درمیان گھاس کا قطعہ تھا۔ اس قطعہ کو پار کر کے جاتے ہوئے نسرین مغل کو اپنی ٹانگیں شل ہوتی محسوس ہوئیں۔ اب وہ ان سرگوشیوں کو زبان دے چکی تھیں جو عاتکہ کچھ عرصہ سے ارد گرد سے اٹھتی ہوئی پا رہی تھی۔ ان خدشات پر مہر لگا گئی تھیں جو عاتکہ کی آنکھوں کو رات رات جگائے رکھتے تھے۔ حلال حرام کا فلسفہ بھی اس کے علم میں تھا۔ ضرورت اور خواہش کے اسباق بھی وہ جانتی تھی۔ انصاف اور زیادتی کے تقاضے بھی اس کی نگاہ میں تھے مجبوری اور خوشی سے بھی آشنا تھی۔ حقیقتیں بھی سمجھتی تھی لیکن پھر بھی عورت ہی تھی، بیوی بھی تھی، فاطمہ کی ماں ہونے کا مان بھی تھا۔ خاندانی بیوی ہونے کا فخر بھی تھا ساس سسر کی من چڑھی بہو ہونے کا بھی احساس تھا۔ ان سب کے باوجود بھی وہ خاموش لکڑی کی مانند اندر سے سلگتی تھی۔ لکڑی صندل اور ساگوان کی ہو تو سلگتے بھی خوشبو ہی دیتی ہے۔ عاتکہ بھی سلگ رہی تھی لیکن ذات سے بھلائی اور وجود سے خوبیاں اطراف میں بکھرتی جا رہی تھیں۔ بیگم سراج مغل کے سر پر رکھے تاج نے اسے تاجور بنا کر دنیا میں نامور کر دیا تھا۔ تقریبات میں جہاں سراج کی شرکت کروانی ناممکن ہوتی وہاں لوگ عاتکہ کی موجودگی کو ہی اعزاز سمجھتے تھے۔ وہ دنیا کے معیارات پر دل میں

کسک تو محسوس کرتی، اس کی موجودگی میز بانوں کو دوسروں پر شان جمانے کا بھی موقع فراہم کردیتی۔ بیگم سراج مغل کی حیثیت سے دنیا کے کئی ممالک کے سفر بھی ہو چکے تھے اور کئی عمرے بھی۔ بظاہر وہ مہارانی ہی تھی۔ ایسی مہارانی جو شوہر کے دل کی رانی نہ تھی۔ یہ حقیقت تین ہی عورتیں جانتی تھیں ایک سراج کی والدہ دوسری عاتکہ اور تیسری جیکولین تینوں ہی نے یہ آگاہی رکھنے کے باوجود کسی بھی لمحہ اس کو زبان پر نہ آنے دیا تھا۔ نسرین مغل اور عاتکہ کے لئے یہ بھرم کا سوال تھا تو جیکولین کی ادائے بے نیازی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ بلاشرکت غیرے سراج مغل کے دل پر حکومت کرتی ہے۔ ہاں اس نے دماغ کو خاصا جدا رکھا تھا دل سے، اپنی اہمیت سراج کو باور کرانا وہ خوب جانتی تھی۔

''فلاں جگہ صحت کانفرنس ہے، بطور مہمان اسپیکر مجھے بلایا گیا ہے۔ انٹرنیشنل کانفرنس ہے، تم بھی چلو بہت ہی سودمند رہے گا۔''

اب یہ کانفرنس مغل کے لئے کتنی سودمند رہی یہ تو حساب کتاب کیا ہوتا ہاں جیکولین کی اثر پذیری کا نظارہ ضرور ہو جاتا جیکولین عقلمند عورت تھی۔ سراج کی اہمیت دنیا کے سامنے خود دکھائی تا کہ شوہر کی فطری انا کا جھنڈا بھی بلند رہے اور اس کا راج شوہر پر مضبوط رہے۔

بے حساب مصروف زندگی سے سراج مغل کو دیئے جانے والے وقت کا کبھی نہ دورانیہ کم ہوا اور نہ عمدہ کیفیت۔ ہمیشہ ہی سراج مغل مسخر رہا اور ہمیشہ ہی جب وہ جیکی کے پاس سے لوٹتا تو اسے زندگی کے نشیب وفراز معمولی لگنے لگتے۔ اس کے ساتھ گزرا وقت جیسے اس کو چارج کر دیتا۔ نت نئے منصوبے ذہن کی سطح پر نمایاں تفصیلات کے ساتھ ظاہر ہو جاتے اور پھر جب وہ حقیقت میں ڈھلتے تو سراج مغل کے لئے جیکولین کا درجہ آکسیجن کا سا ہو جاتا۔ چھوٹے پیمانے پر قرض، بلاسودی قرض کی فراہمی، ریسرچ کے لئے مالی مدد کی فراہمی، نت نئے زرعی بیج اور کھاد کا استعمال ممکن بنانا...... یہ سب ان بے شمار منصوبوں میں سے تھے جو سراج مغل کے ذہن میں کلبلاتے رہتے تھے۔ منصوبے اکثر جیکولین کے پاس سے لوٹتے وقت مبہم سے خاکے سے واضح خدوخال میں ڈھل چکے ہوتے۔ وہ اور بات تھی کہ دوسرے عوامل، منفی عوامل جو ملک کو سیم وتھور کی مانند چاٹ رہے ہیں وہ ان منصوبوں کو بھر پور اگنے کا موقع فراہم نہیں کرنے دیتے لیکن جو بھی ایک آدھ کونپل پھوٹتی اور اس کونپل سے جس قلیل تعداد کو تقویت ملتی وہ سراج مغل کو متحرک رکھتی۔ گھپ اندھیرے میں لپکنے والے لمحہ بھر کے شعلہ سے جتنا بھی فیض مل رہا تھا وہ سراج مغل کو رواں کر دیتا اور جیکولین دل کے مقام پر اور بلند ہو جاتی۔ ایک دور پار سے آیا انسان کیسے میرے دیس کے لئے اپنی توانائیاں خرچ کر رہا ہے، کیا عمدہ بات ہے'' وہ جیکولین کو مختلف منصوبوں میں مصروف دیکھ کر ضرور یہ سوچتا۔

ایسے میں بھولے سے بھی عاتکہ خیالات کی کسی لہر میں نہ ابھرتی۔ نفع بخش عاتکہ بھی تھی۔ لیکن یہ ایسا ہی تھا جیسا کہ برف پر تیز اسکیٹنگ کرنے والے کو زمین پر تیز قدم اٹھانا کوئی مہارت نہیں لگتی۔ حالانکہ زمین پر قدم جما کر چلنا بذات خود ایک ہنر ہے۔ سراج مغل کو بھی عاتکہ کی قابلیتیں بارش کی چند بوندیں ہی لگتیں۔ برسیں تو لمحہ بھر میں غائب اور نہ برسیں تو بھی کوئی فرق نہیں۔ ہاں فاطمہ اور فاطمہ کے بعد آمنہ وہ زبردست کشش کے ماخذ تھے کہ سراج مغل عاتکہ کے پاس کھنچا چلا آتا۔ دونوں بیٹیاں باپ سے ایسے والہانہ انداز میں ملتیں کہ عاتکہ حیران ہو جاتی کہ اس نے اپنے اردگرد بچوں کو اس انداز میں نہ دیکھا تھا۔ وہ ناز برداری کرواتے تھے یہ باپ سے دل موہ لینے والی باتیں کرتی تھیں۔

''ڈیڈی میں جب بھی آنکھیں بند کرتی ہوں فوراً آپ کی موی شروع ہو جاتی ہے۔'' فاطمہ باپ کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہتی۔ آمنہ ابھی چند ماہ ہی کی تھی باپ کو دیکھ کر ہاتھ پیر چلانے لگتی۔ سراج مغل کو بیٹیاں نہال کر دیتیں۔ وہ دونوں کو خوب خوب پیار کرتا اور پھر اس برستی برکھا میں عاتکہ بھی فیضیاب ہو جاتی۔ وہ اچھا شوہر تھا۔ یہ اعتراف ہمیشہ عاتکہ نے کیا، کسی بھی طرح کی مادی فراہمی میں کبھی کوئی خلل نہ آیا۔ کوئی ضرورت نہ رکی۔ بس خاتون اول نہ ہونے کی خلش تھی جو تیز دھار کی طرح عاتکہ کے دل کو کاٹتی رہتی اس میں بھی قصوروار کوئی نہ تھا۔ سراج کا دل تھا جو جیکولین پہ عاشق تھا اور عاتکہ تھی جو ذمہ داری تھی، جسے وہ بہ خوبی نبھا رہا تھا۔ ہاں سراج کی آنکھیں نہ مسکراتیں اور ہونٹوں سے ہنسی نہ پھوٹتی، چہرہ نہ روشن ہوتا اور سنجیدگی میں مزاح نہ ابھرتا۔ یہ سب عاتکہ کے

ساتھ باوجود کوشش کے بھی نہ ہو پاتا کیونکہ دل کی ملکہ جیکولین تھی۔

"بے شمار انسانوں کے لئے میں دنیا کی خوش نصیب عورتوں میں سے ہوں لیکن کیا واقعی ایسا ہی ہے؟ کیا مجھے یہ ساری موجودہ نعمتیں کم درجہ پر عطا کی جاتیں اور ایک عمومی سے انسان کی بیوی بنایا جاتا تو میں زیادہ خوش رہتی؟ کیا دنیا کی ہر عورت خوش رہتی ہے جو شوہر کے دل پر راج کرے بلاشرکت غیرے؟" یہ اور ایسے کئی سوالات وہ اکثر اب اپنے آپ سے کرتی، تو اکثر یہی جواب آتا "ایسا کچھ نہیں ہوتا...... انسان ایک نعمت سے سیر ہوتے ہی دوسرے کی کمی پر توجہ مرکوز کر دیتا ہے اور دوسرے کے بعد تیسرے کی کمی اسے گھلانے لگتی ہے۔ تیسرے کے بعد چوتھا عفریت بن کر ابھرتا ہے غرض یہ سلسلہ جاری ہی رہتا ہے۔ اس لئے پہلے ہی مرحلہ پر زندگی میں موجود پھانسوں اور خلشوں کو بتانے والے سگنلز پر رب سے تجدیدِ عہدِ وفا کر لینی چاہیے۔ میرے رب جو تو نے دیا وہ تیرا احسان، جو نہ دیا اس کی توقع تجھ سے ہی ہے۔ ہمیں ہر حال میں اپنا شکر گزار رکھ اور ہمارے ناز اٹھالے۔"

اور پھر رب نے عاتکہ کے ناز اٹھائے، جیکولین اور سراج مغل کی اولاد ہی نہ ہوئی۔ جیکولین کی مصروف ترین زندگی میں ماں کا اعلیٰ ترین کردار ادا کرنے کی گنجائش تھی اور نہ خواہش، سو عاتکہ کا مقام جدا ہی رہا۔ فاطمہ اور آمنہ کے بعد ماریہ اور پھر افنان مغل سراج مغل کے لئے عاتکہ کے مقام کی جڑیں پھیلاتے ہی چلے گئے۔ جیکولین جیسی بلندی پر وہ پہنچ سکی یا نہیں لیکن یہ بات مسلمہ تھی کہ صاحب اولاد سراج مغل کو رب نے صرف اس کے ہی ذریعے کیا۔ یہ ایسا رتبہ تھا جو دل پر پھاہے رکھ دیتا تھا۔ بلاشبہ شکر گزاری نے اس کی زندگی کو آبلہ پائی سے محفوظ کر دیا تھا۔ وہ بھاگ نہ خرید سکتی تھی، مگر صبر و شکر کی ردا نے اسے سوچوں کے دشت میں قیدی بننے سے بچالیا۔ پھولوں کی سی لطافت رکھنے والی عاتکہ نے کونج کی طرح شور مچانے کے بجائے ملی ہوئی نعمتوں سے زندگی کے خدوخال روشن کر لئے اور کبھی جو احساسِ زیاں آنکھوں کے راستے قطرے ٹپکاتا تو منجمد ہوتی دل کی کیفیت جیسے صبر و شکر کے تمام اسباق ہی اسے بھلا دیتی اور وہ آہ و گریہ کر جاتی۔ انسان تھی، انسان ہی رہی۔ سراج مغل بھی انسان تھا...... ماں اور دل کی خواہش کے درمیان گردش کرتا۔ زندگی کے بند دروازوں پر نگاہ جمانے کے بجائے رخ پھیرنے کا ہنر...... اور کھلے دریچوں سے آتی روشنی کی جانب سے رخ پھیرنے کے بجائے رخ کرنے کا ہنر...... دونوں ہی کو سیکھنا پڑا تھا کہ زندگی نام ہی ایسی مزدوری کا ہے جس میں اجرت پانے کے لئے قدم قدم پر رفوگر بننا پڑتا ہے!!

☆......☆......☆

ممتا

یہ واقعہ میری مرحومہ والدہ صاحبہ نے سنایا تھا۔ وہ اس واقعے کی چشم دید گواہ تھیں۔ یہ ہندوستان پاکستان کی تقسیم سے قبل کا واقعہ ہے۔ آپ یوں کہہ سکتے ہیں اسے ساٹھ برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر یہ واقعہ مجھے اس لیے یاد ہے کہ اس واقعے کے ساتھ اللہ کا عذاب وابستہ ہے۔ ہم فانی انسان اپنی زندگی میں ایسے بہت سے واقعات سے گزرے ہیں لیکن ہم میں سے شاید چند ہی ہیں جو ایسے واقعات سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ مرحومہ والدہ صاحبہ نے بتایا تھا کہ ان کے تایا ابو سول انجینئر تھے۔ گھر میں بہت خوشحالی تھی اور روپے کی ریل پیل تھی۔

بس یہ اتفاق ہوا تایا ابو کی شادی بہت لیٹ ہوئی جس وقت ان کی شادی ہوئی تایا ابو کی عمر ۳۴ برس تھی جبکہ تائی اماں چودہ سال کی کم سن سی معصوم لڑکی تھیں۔ اب یہ اتفاق ہو گیا کہ شادی کے گیارہ برس گزرنے کے بعد بھی اللہ نے گود ہری نہ کی۔ ادھر تایا ابو کے ایک اور کولیگ جو اسی گلی میں رہائش پذیر تھے وہ بھی اولاد سے محروم تھے۔ تایا ابو کا ان کے کولیگ کے گھر خوب آنا جانا لگا رہتا تھا اور یہ دوستی ایک دن کی یا ایک سال کی نہیں بلکہ یہ کئی سالوں پہ محیط دوستی تھی اور آپس میں دونوں گھرانے بہت بے تکلف بھی تھے اور اتفاق کی بات کہ وہ بھی اسی دکھ سے گزر رہے تھے جس سے تایا ابو گزر رہے تھے۔ اولاد کی کمی دونوں گھرانے محسوس کرتے لیکن اللہ کی رضا سمجھ کر چپ رہتے۔ اللہ کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ تائی اماں کو اللہ نے اولاد عطا کی۔ ایک پھول سی بیٹی جو گیارہ برس کے طویل انتظار کے بعد ان کے گھر میں خوشیوں کا جھونکا بن کر اتری۔ لیکن اللہ جانے...... تایا ابا کے اپنے اس کولیگ کی بیوی سے کیسے اور کس نوعیت کے تعلقات تھے، یا پھر وہ عورت اتنی زور آور تھی، یا پھر اتنی ظالم تھی کہ جس نے تایا ابو کو کہا، بیٹی تو تمھاری ہے تمھاری رہے گی مگر اسے پالوں گی میں۔ ہو سکتا ہے اس عورت نے تائی اماں کی کم عمری، کم گوئی اور بھولپن سے فائدہ اٹھایا ہو۔ ادھر تایا ابو کو بھی ترس نہ آیا کہ وہ ایک دوسری عورت کی خواہش کے پیچھے اپنی بیوی کو بیٹی سے محروم کیے دے رہے ہیں۔

چنانچہ چھلے کے فوراً بعد تایا ابو نے بچی ماں کی گود سے اٹھالی اور صبح صبح دفتر جانے سے پہلے اس عورت کی گود میں ڈال آئے۔

ایسی عورت جس کو پہلی اولاد گیارہ سال بعد ملی ہو...... آپ اس کی تڑپ، بے قراری اور ممتا کی بے چینی کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ تائی اماں نے گھر میں احتجاج کیا، روئی، بلکیں، واسطے دیے...... بچی دودھ پیتی تھی...... لیکن وہ کٹھور انسان ایک ماں کی آہ وزاری اور دکھ کو سمجھے بغیر کہنے لگا۔

''بیٹی تو تمھاری ہے...... تمھاری رہے گی...... وہ کوئی چھین تو نہیں رہی تم سے بچی...... رات کو تمھارے پاس لے آیا کروں گا...... لیکن صبح سے شام تک وہ بچی وہیں پلے گی۔''

''اتنے سنگدل اور ظالم نہ بنو۔ وہ بچی بغیر دودھ کے کیسے جئے گی...... ابھی تو میں نے جی بھر کر اسے دیکھا نہیں...... اسے پیار نہیں کر کے دیکھا......'' وہ روتے روتے بکھر جاتیں۔

''دودھ کی تم فکر نہ کرو...... وہ ڈبے کا دودھ ہے ان کے پاس باقی رہی پالنے کی وہ تم سے بہتر پال سکتی ہے۔ سمجھدار ہیں، تم سے زیادہ سگھڑاپا اور ذہانت ہے ان کے پاس...... رات کو تمھارے ساتھ بچی سوتی ہے...... پھر تمھیں کیا تکلیف ہے جو وہ دن بھر ادھر رہ لے گی...... اور کان کھول کر سن لو...... یہ روز کا رونا دھونا یہ ٹسوے بازی مجھے پسند نہیں...... اور آئندہ خبردار جو شور مچایا...... ذرا دیکھو تمھاری بیٹی ادھر دن بھر رہنے

سے بیچاری کی ممتا کوتسکین حاصل ہو جاتی ہے۔ ''تمھارا کیا نقصان ہے اس میں۔''

اس بے رحم آدمی کو یہ احساس نہ ہوا کہ جس ماں کے جگر کا وہ ٹکڑا ہے وہ اپنی ممتا کی تسکین کے لیے دن بھر باؤلی پھرتی رہتی ہے۔ کوئی قلقاری کوئی ہنسی......اس کے پاس نہیں......اس کی بانہیں بچی کو جھلانے کے لیے بے تاب رہتی ہیں۔ اس کا دودھ چڑھا رہتا ہے۔ کیسا اندھیرا تھا۔

ادھر قدرت نے بچی کے لیے وافر دودھ عطا کر رکھا تھا اور ادھر بچی فیڈر کے دودھ پر پل رہی تھی......ایک دکھ تکلیف......تو بچی کی جدائی تھا......دوسرا دکھ شوہر کا پراسرار کٹھور اور بے رحم رویہ تھا......تیسرا دکھ وہ جسمانی عارضہ تھی جو بچی کے دودھ نہ پینے کے سبب پھوڑا ہو رہی تھی۔

وہ دن بھر بے چین روح کی طرح اپنے گھر میں بولائی بولائی پھرتیں۔

بچی کے ننھے منے فراک اٹھا کر پیار کرتیں کبھی خالی جھولا جھولانے لگتیں......چند قدموں کے فاصلے پر ان کی بچی تھی۔ ان کا اپنا خون...... جس کے رونے کی آواز کبھی ہوا کے دوش پر ان کے گھر آ جاتی تو وہ بے تاب ہو کر رونے لگتیں۔ ان کے شوہر نے اس عورت کے گھر جانے اور بچی واپس لانے سے منع کر رکھا تھا کہ وہ صرف رونے، کڑھنے اور اپنا دل جلانے کے سوا کچھ نہ کر سکتی تھی۔ رات کو بچی کندھے سے لگائے وہ عورت ٹھکے سے آتی اور اس طرح بچی گود میں دیتی۔ جیسے احسان کر رہی ہو کبھی اس کے شوہر خود ہی واپسی پر بچی کو لیتے آتے۔

بچی تھوڑا سا کھیل کر جلدی سو جاتی......وہ ممتا کی ماری دن کو بچی کی کھلتی ہنستی شکل دیکھنے کو ترس جاتیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ادائیں، اس کی توتلی غوں غاں......سب ایک بکھرے ہوئے خواب کی طرح ہو چکا تھا۔ وہ رات بھر بچی کو پیار کرتیں کبھی اس کا چہرہ چومتی کبھی ہاتھ پر پیار کرنے لگتیں......آنسو ساری رات آنکھوں سے گرتے رہتے۔

''اب سونے دو بچی کو......کیوں ڈسٹرب کر رہی ہو......آرام کرنے دو اسے۔''

میاں کی ایک گھرکی ایک جھڑکی اور ایسا سخت لہجہ انھیں اندر سے مار ڈالتا۔ اور ان کا تڑپنا دوچند ہو جاتا۔ وہ اپنی کم نصیبی پر روتیں......تو ساری رات تکیہ بھگو ڈالتیں......لیکن ساتھ کے بستر پر سوئے بے رحم انسان کو ذرا برابر بھی ترس نہ آتا۔ تائی اماں کے آگے پیچھے کوئی زور آور نہ تھا کہ کوئی خیر خبر لینے آ جاتا......بچی کے آنسو ہی پونچھ لیتا......اور اس ظالم پر اس کی باز پرس ہی کرتا۔

تائی اماں صبح تک انگاروں کے بستر پر لوٹتیں......جسمانی، ذہنی اور روحانی دکھ مل کر چاروں طرف سے ان کو گھیر لیتے......طبیعت خراب ہونے لگتی مگر وہ بے حس مرد منہ دوسری طرف کیے سویا پڑا رہتا......اور صبح صبح دفتر جانے سے پہلے آدھی سوئی آدھی جاگی بچی ویسے ہی کپڑوں میں لپٹے لپٹائے اٹھاتا......اور اس عورت کے گھر جا کر دے آتا......ممتا کی ماری تائی اماں ماہی بے آب کی طرح تڑپتی اور پھر بے سکونی کے اندھیرے ان کی روح کو گھیرے میں لے لیتے۔ تائی اماں کو ان دنوں نہ اوڑھنے کا شوق رہا تھا نہ پہننے کا......تائی اماں کے چہرے پر یاسیت اور خوف جھلکنے لگا تھا وہ ابھی صرف چوبیس پچیس برس کی تھیں لیکن دیکھنے میں اپنی عمر سے کہیں بڑی لگتیں۔

قدرت ممتا کی ماری معصوم لڑکی کے دکھوں کو دیکھ رہی تھی......اللہ کے اپنے سب کام نرالے ہوتے ہیں......انھی دنوں معلوم ہوا کہ دوسری عورت کے ہاں بھی اللہ نے کرم نوازی کر دی ہے اور بارہ سال بعد وہاں بھی خوشیاں آنے والی ہیں۔ تائی اماں نے شاید اس عورت سے بڑھ کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ چلو اس بہانے اب ان کی بیٹی تو واپس مل جائے گی......اور اب وہ دوسری عورت اپنی گود میں بیٹی یا بیٹا کھلائے گی......اور تب اسے علم ہو گا کہ ماں کی نظر سے چند گھنٹے بھی بچہ اوجھل رہے تو ماں کی کیفیت کیا ہو جاتی ہے؟ اور وہ کیسے انگاروں پہ لوٹتی ہے؟ اور اس کی جان کیسے سولی پہ لٹک جاتی ہے......بچے کی ذرا تکلیف ذرا سی بیماری کیسے اس کا لہو خشک کر دیتی ہے......وہ دوسری عورت اپنے ہاں بچہ ہونے کی خوشی میں مزید اکڑنے لگی اور اب اس کی بول چال اور عمومی رویے میں عجیب سی نخوت و شیخی تکبر اور دوسروں کے لیے مزید حقارت آ گئی۔ تائی اماں

کے ساتھ اس کے رویے میں پہلے سے بھی بڑھ کر درشتگی آ گئی۔ جیسے کہہ رہی ہو......''تم ماں بنی تھیں......لو ہم نے بھی ماں بن کر دکھا دیا نا۔''

تائی اماں خیر سے آنے والے وقت کا انتظار کر رہی تھیں ...... انھیں لگ رہا تھا جیسے ان کے عذاب کے دن کٹنے کو ہیں ......اپنا بچہ ہو گیا تو یہ جو میری بیٹی کو یرغمال بنائے بیٹھی ہے......اسے تو رہائی مل جائے گی ......اور میری آنکھیں جو دن بھر بچی کی شکل دیکھنے کو ترس گئیں ہیں وہ تو تسکین پائیں گی۔

پھر بچی کو صحیح معنوں میں علم بھی ہوگا کہ ماں کون ہے؟ کیونکہ دن بھر وہاں دوسرے گھر رہ کر وہ بچی ان سے مانوس ہوتی چلی جا رہی تھی ...... اور سگی ماں کی طرف اس کا رجحان غیریت لیے ہوئے تھا۔ وہ شوخی ...... وہ شرارتیں......جو ایک بچپن کا خاصا ہیں وہ جیسے دوسرے گھر ہی چھوڑ آتی تھی۔ شام گئے اجنبی اجنبی سی چپ چاپ اونگھتی سوئی بچی آتی جو جلد ہی نیند کی آغوش میں چلی جاتی ...... اور ماں رات بھر جاگ کر اس کے چہرے کو دیکھ کر آنسو بہاتی رہتی۔

آخر وہ لمحہ آن پہنچا...... پتا نہیں اس عورت کی نیت کیا تھی؟ وہ جو اس کی بیٹی پر شوہر کی وجہ سے سارے کا سارا حق جمائے بیٹھی تھی ...... یا اس نے مزید اور کیا ظلم کے پہاڑ توڑنے تھے۔ تائی اماں کو اور کتنا رلانا تھا اور تڑپانا تھا۔ قدرت کا غیبی ہاتھ آگے بڑھا اور وہ عورت جس نے زمانے بھر کو آگے لگا رکھا تھا...... جو من مانی کرتے نہیں ڈرتی تھی ...... جسے کبھی اللہ کا خوف نہیں آیا تھا۔ جو اب مزید غرور میں مبتلا تھی......جس نے صحت اور حسن کے بل بوتے پر تائی اماں کے شوہر کو اسیر کر رکھا تھا۔ جو ہمیشہ اپنی خوشی پیش نظر رکھتی تھی جسے تائی اماں کو چڑا کر، رلا کر اور ستا کر مزہ آتا تھا......وہ صحت کا اور حسن کا پیکر زچگی کے دوران مر گئی۔ نہ وہ رہی نہ اس کا بچہ......اور یوں بچی جو اس وقت سال بھر کی تھی ماں کے پاس واپس آ گئی۔

وہ ماں جو سال کے پورے دنوں اور پوری راتوں میں اس کی جدائی کے ملال میں روئی تھی، جس کی بانہیں اسے آغوش میں بھرنے کے لیے بے تاب تھیں، اللہ نے ماں سے بچی کو جدا کرنے والی دیوار گرا دی۔

ورنہ اس ظالم عورت سے کیا بعید ...... بعد میں کیسے حالات کو مزید بگاڑتی۔ تائی اماں کی بچی اکلوتی رہی، تایا ابو بھی جلد انتقال کر گئے اور یوں یہ عبرت ناک کہانی اپنے انجام کو پہنچی اور حقدار کو اس کا صحیح حق مل گیا۔

(انتخاب: آسیہ کلثوم۔صادق آباد)

☆......☆......☆

افشاں نوید

لامکاں

یہ نقطے......پھر دائرہ در دائرہ ہمیں قید کرلیں گے...... ہماری سوچوں سمیت

جہاز آہستہ آہستہ فضا میں بلند ہورہا ہے۔اور جب وہ رن وے پر دوڑ رہا تھا تو ہم ایئرپورٹ پر لگے درختوں کے پھولوں اور راہداریوں میں لگی ٹائلوں کے رنگ بھی جہاز کی کھڑکی سے دیکھ رہے تھے۔پھر ایک جھٹکا اور تیزی سے رن وے پر دوڑتے جہاز نے زمین سے ناطہ توڑلیا۔

جب جہاز فضا میں بلند ہوتا ہے تو احساسات کتنے عجیب ہوتے ہیں۔زمین سے بلند ہونے کا تصور...... بادلوں سے بلند، دس ہزار کبھی بیس ہزار یا اس سے زیادہ فٹ کی بلندی۔ جب تک جہاز دوبارہ رن وے کو نہ چھولے،ایک فضا میں معلق فرد کیا کیا سوچ سکتا ہے......مگر اب لوگ سوچنے کے لیے وقت ہی کہاں پاتے ہیں!

میرے چاروں طرف جو مسافر بیٹھے تھے کچھ ادھیڑ عمر کے لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے اور کچھ اخبارات کی ورق گردانی میں۔ نوجوان لیپ ٹاپ پر دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔کچھ خواتین نیند پوری کررہی تھیں اور کچھ بچوں کے ناز اٹھارہی تھیں۔میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

جب جہاز بلند ہونا شروع ہوا تو ہمیں اطراف کی بستیاں صاف نظر آرہی تھیں پھر گھر چھوٹے اور چھوٹے ہوتے گئے۔پھر لکیروں کی صورت میں سڑکیں اور نقطوں کی صورت میں ان پر پھسلتی گاڑیاں۔پھر مکان نقطوں میں تحلیل ہوگئے اور پھر نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

ہم سب اپنے مکانوں کو چھوڑ آئے ہیں،واپس پلٹنے تک!ہمارے یہ مکان جو نقطوں میں تحلیل ہوکر نظروں سے اوجھل ہوگئے،وہ بستیوں کی بستیاں جن پر سے ہم لمحوں میں گزر گئے،ہمارے مکان،ہماری بستیاں، بستیوں کے لوگ...... کیسے کیسے عبرت دلاتا ہے رب بستیوں کے ان لوگوں کو پچھلے گزرے ہوئے لوگوں کے واقعات یاد دلا کر......رسول بھیجے گئے۔شریعتیں اتاری گئیں۔ایک ہی تو غرض تھی کہ بستیوں کے لوگ ایمان لے آئیں۔شریعت موجود ہے،الہامی تعلیمات موجود مگر بستیوں کے لوگ باغیانہ روش چھوڑنے پر آمادہ ہی نہیں۔

آہ...... یہ ہماری بستیاں ...... ہمارے مکان...... یہ قلعے نما گھر...... چھوٹے گھر، بڑے گھر، جھونپڑیاں، فٹ پاتھوں کے باسی لوگ...... بہت سے محل نما گھروں میں رہنے والوں کے دماغ جھونپڑیوں میں رہتے ہیں......اور بہت سے گدڑی کے لال پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کرتے ہیں۔

ہمارے مکان تو اصلاً ہمارے ذہن ہی ہیں۔وہ چھوٹے ہوں یا بڑے......کتنی حفاظت کرتے ہیں ہم اپنے مکانوں کی ...... اور اپنے ذہنوں کو کن کن وادیوں میں بھٹکنے کیلئے آوارہ چھوڑ دیتے ہیں!

وہ مکان جو اوجھل ہوگئے لمحہ بھر میں نظروں سے...... کتنے قیمتی ہیں ہمیں یہ مکان،کتنی حفاظت کرتے ہیں ہم ان کی۔سکیورٹی گارڈ رکھتے ہیں،آٹومیٹک سکیورٹی سسٹم سے اپنے مکانوں کو محفوظ کرتے ہیں۔ بلند دیواریں،آہنی دروازے......

وہ کیا چیز ہے جس کی ہم اتنی حفاظت کرتے ہیں؟

مکانوں کی ان فصیلوں سے ہزاروں فٹ بلند،زمین وآسمان کے درمیان معلق میں سوچ رہی ہوں۔

ہم اپنے مکانوں کی حفاظت کے لیے اس قدر احساس ہیں جبکہ ہماری بستیاں غیر محفوظ ہیں۔

ہم اپنے مکانوں کی سجاوٹ کی فکر کرتے ہیں جبکہ بستیاں لٹ رہی ہیں۔

ہم سماج سے بے نیاز اپنے مکانوں کے جسم میں قید ہیں۔ان کو جنت یا جنت نما بنانا ہماری اولین آرزو ہے۔یہ مکان ہماری شناخت بن گئے،عزت اور بڑائی کا معیار بن گئے۔اچھے بڑے مکان کی خواہش،وہ

جائز طریقے سے حاصل نہ ہو سکے تو ہر ناجائز راستہ اختیار کر لیتے ہیں ہم۔ یہ مکان ہماری پیشانیوں پر فخریہ سجے ہوئے جھومر ہیں۔ یہ ہمیں بہت عزیز ہیں۔

مگر یہ ہمیں کیوں عزیز ہیں؟

اس لئے کہ ہم آرام کی طلب میں ان کا رخ کرتے ہیں۔ یہ درودیوار یہ مکان، ہمیں آسودہ کرتے ہیں۔ مزید آرام، مزید آسودگی، ھل من مزید کی طلب، قبروں تک پہنچا دیتی ہے۔ اپنے گھروں کو مزید آسودہ بنانے کے لئے ہم دنیا بھر کے سامانِ تعیش اکٹھا کرنے میں اپنی زندگی کا کتنا قیمتی وقت لگا دیتے ہیں۔ ہم ان مکانوں کو اپنا گھر سمجھتے ہیں، فی الواقع یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔

ہاں ابھی ابھی پائلٹ نے اعلان کیا ہے کہ اس وقت ہم دس ہزار فٹ کی بلندی پر سفر کر رہے ہیں۔ ہم نصف گھنٹے میں اپنے مطلوبہ ایئرپورٹ پر لینڈ کریں گے۔ یہ خواہش ہی تو ہے کہ ہم لینڈ کریں گے۔ ہمیں منزل پر پہنچنا ہے۔ ہم مسافرت کے گھر میں ہیں۔ ہم حقیقتاً خود کو مسافر تو نہیں سمجھتے۔ ہمارے رہن سہن کے طریقے، طرز بود و باش ہرگز نہیں بتاتا کہ ہم مسافر ہیں اور منزل کو پہنچنے والے ہیں۔ یہ فضائیں، یہ سمندر اس نے کلیتاً ہمارے اختیار میں تو نہیں دے دیئے۔ ہر مسافر منزل پر کامیاب ہی پہنچے یہ ضروری بھی نہیں۔ کبھی پہاڑوں سے ٹکرا جاتے ہیں یہ جہاز، کبھی پانیوں میں گر جاتے ہیں اور دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ کبھی کبھی لاپتہ بھی ہو جاتے ہیں۔ جدید ترین ٹیکنالوجی رکھنے والا انسان پہاڑوں اور سمندروں میں انہیں تلاش ہی کرتا رہ جاتا ہے اور کبھی ٹائٹینک کی صورت میں دنیا کے کبر کے منہ پر ایک ہلکی سی چپت رسید کی جاتی ہے کہ خدا کی خدائی میں رہتے ہوئے خدا بننے کا دعویٰ کب زیب دیتا ہے تمہیں!

لینڈنگ کے لیے جہاز نیچے اتر رہا ہے۔ چند لمحوں میں جہاز رن وے کو چھو لے گا۔ ہم اپنی سوچوں سمیت فضاؤں سے زمین پر آ جائیں گے۔ پھر اپنے ان مکانوں میں جو ہمارا خواب ہیں، جو ہماری آرام گاہیں ہیں، جو نقطوں میں گُم ہو گئے تھے تو کتنے حقیر لگ رہے تھے، کم مایہ...... اب پھر دائرہ در دائرہ ہمیں قید کر لیں گے ہماری سوچوں سمیت۔ وہ بڑے بڑے گھر بنانے والے، مکان تعمیر کرنے والے جو خیالوں کی دنیا میں ایک جھونپڑا بھی تعمیر کرنے کی سکت نہیں رکھتے شاید!

یہ سفر تو کبھی کبھی حاضر و موجود سے بیزار کر دیتے ہیں۔ وہ مکان جو نقطوں میں تبدیل ہو گئے تھے......بس اتنی ہی حقیقت ہے ان کی...... اور جو حقیقت ہے وہ دھوکہ ہے، سراب ہے جس کے آخری سرے پر صرف العطش ہے۔ اگر ان مکانوں کو زبان مل جائے تو ہماری ہوس کی کہانیوں کی کتابوں کیلئے کتنے ہزار نئی لائبریریاں بنانا پڑیں گی۔

گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!

☆......☆......☆

فرحت طاہر

دو دروازے

شمسی اور قمری مہینے ریل کی پٹریوں کی مانند ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں کبھی کسی مقام پر دونوں ملتے اور پھر جدا ہو جاتے ہیں! عموماً تیس بتیس سال بعد ان کا ملاپ ممکن ہوتا ہے۔ کچھ ایسا ہی اتفاق اس سال نظر آ رہا ہے۔ ہماری ذاتی اور قومی زندگی کے اہم واقعات اور سانحات میں اس حوالے سے دلچسپ صورت حال نظر آتی ہے۔

اکتوبر ۲۰۰۵ میں شمالی علاقہ جات میں زلزلہ آیا تو رمضان کا مہینہ تھا اور آج دس سال بعد جون کا مہینہ ہے! نومبر کے رمضان میں پیدا ہونے والی بہن اور جولائی میں پیدا ہونے والے دو سال چھوٹے بھائی کی سالگرہ ایک دن پڑتی ہے۔ ایک کی شمسی لحاظ سے تو دوسرے کی قمری لحاظ سے! اس کا دائرہ دیگر معاملات میں بھی نظر آتا ہے۔ دو بھائیوں کی شادیاں ذوالحج میں (کئی سال کے وقفوں سے) سرانجام پاتی ہیں تو بلحاظ شمسی کیلنڈر اگست سے مارچ آ جاتا ہے! جبکہ اسکے برعکس دو بھائیوں کی شادی ماہ مارچ میں ہوتی ہے مگر درمیان میں نو سال کے وقفے کی وجہ سے ذوالحج کے بجائے ربیع الاول آ جاتا ہے!

یہ ہی صورت حال اموات کے معاملے میں بھی نظر آتی ہے! ہماری امی کا انتقال رجب میں جبکہ ابا ربیع الثانی میں اور بڑے ابا محرم میں اللہ کو پیارے ہوئے مگر قمری مہینوں کے تفاوت کے باوجود تینوں میں جون کا مہینہ تھا۔ اس کے علاوہ مختلف شمسی مہینوں جدا ہونے والی نانی، خالہ، ماموں اور نانا شعبان، رمضان اور عیدالفطر (چاند رات) کو دنیا سے رخصت ہوئے گویا اس سال رمضان اور جون ایک ساتھ طلوع ہوئے تو اپنے جلو میں میرے تمام قریبی بزرگوں کے یوم وفات لے کر نمودار ہوئے۔

ہماری زندگی میں اس سے پہلے بھی جون کے مہینے میں رمضان آ چکا ہے۔ اس کی یادیں بہت اہمیت کی حامل ہیں کیونکہ اس سال اسی شدت کی گرمی دیکھی تھی اور ہمارے لیے اس لیے بھی یادگار ہے کہ پہلے رمضان تھے جو امی کے بغیر گزارے تھے! جی نہیں! وہ زندہ تھیں مگر نائیجیریا گئی ہوئی تھیں جہاں ابا جان ملازمت کے سلسلے میں قیام پذیر تھے۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑنے والا معاملہ تھا! کتنا بوکھلاتی تھی میں! گرمی میں افطار و سحر کی تیاری اور اس سے بڑھ کر اسے واپس فرج میں رکھ کر آئس کریم، شربت اور پھل کے انتظامات کرنا!......جب یادوں کی لڑی اٹھاؤ تو ہر منظر میں سب سے روشن چہرے والدین کے ہیں جو اپنی اولاد کے لیے جہاں زندگی کی ضمانت ہوتے ہیں وہیں جنت کے دو دروازے بھی! میری جنت کے دروازے کیسے تھے؟

دونوں میں قدر مشترک خدمت خلق کے لیے ہمہ وقت تیار، دونوں جذباتی اور سادہ لوح! حد درجہ معصومیت، کوئی بھی بآسانی بے وقوف بنا لے! اپنی نمایاں معاشی اور معاشرتی حیثیت کے باوجود رہن سہن اور مزاج میں سادگی! دونوں پیسہ جوڑنے کے بجائے خرچ کے فلسفہ پر یقین رکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کچھ متفرق اور متضاد ذاتی خصوصیات بھی تھیں۔ امی حد درجہ باتوں کی شوقین تو ابا اس معاملے میں کفایت شاری کے قائل! اس پر بڑے لطیفے سرزد ہوتے تھے۔ ابا منظم اور ترتیب پر جبکہ امی ہنگامہ خیزی پر یقین رکھتی تھیں۔ امی لوگوں کے درمیان خوش تو ابا تنہائی میں! امی تفریح کی دلدادہ تو ابا کی بہترین دوست ان کی کتابیں تھیں۔

یہ ابا کی علم دوستی تھی جس نے انہیں کئی دفعہ گھر سے جدا ہونے پر مجبور کیا! سب سے پہلے بارہ سال کی عمر میں! گاؤں کے مکتب میں بنیادی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دادا کے صاف کہنے پر کہ انکی بساط نہیں کہ وہ انہیں آگے پڑھنے کے لیے شہر بھجوا سکیں وہ گھر سے نکلے اور جب واپس آئے تو اعلیٰ مدرسے میں داخلہ کی خوشخبری ساتھ لائے! دادا کی اخراجات

کے بارے میں فکر کو وظیفہ کی خبر نے دور کر دیا! اگر میرے والد اس وقت یہ مہم جوئی نہ کرتے تو...؟

دوسری جدائی قیام پاکستان کے وقت کی ہے جب پندرہ سال کی عمر میں اپنے استاد کے خاندان کے ساتھ پاکستان روانہ ہو گئے۔ ماں باپ پر کیا قیامت گزری ہوگی؟ اجنبی دیس میں! نہیں یہ تو اپنا وطن ہے جہاں کامیابی منتظر ہے مگر جس کے لیے خون پسینہ ایک کرنا پڑا اور پھر وہ مبارک گھڑی آئی جب خاندان سے ملن ممکن ہوا۔ اس وقت تک ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم کے کئی مدارج طے کر چکے تھے۔ کتنے موقع شناس تھے ہمارے ابا! یہ تمام جدوجہد چند الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی...!

حصول علم کے لیے ان کی تیسری ہجرت جرمنی کی طرف تھی جہاں وہ پی ایچ ڈی کے لیے گئے تھے۔ ساڑھے چار سال پر محیط یہ دورانیہ شاید سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا جہاں ایک طرف غیر ملکی زبان پر عبور حاصل کر کے مقالہ تحریر کرنے کا دباؤ تھا تو دوسری طرف اپنی فیملی کو تنہا چھوڑنے کی فکر جس میں ضعیف والدہ، اہلیہ کے علاوہ چھ بچے جن کی عمریں بارہ سال سے چند ماہ تھیں۔ معاشی مصائب اور معاشرتی خلجان کے ساتھ ساتھ ملک بھی سنگین بحران کی زد میں تھا۔ ماں کے انتقال اور ملک کے دولخت ہونے کے سانحات ایک ساتھ سہنے کو ملے تھے... کس قدر جذباتی دور سے گزرے تھے ابا! ایسے میں بچوں کی آوازوں کے کیسٹ اور تصاویر مایوسی اور تنہائی میں امید اور خوشی کی کرنیں بکھیرتے....! اپنی اولاد کے ساتھ ایک بہترین وقت گزارنے کی محرومی نے انہیں اس معاملے میں اتنا حساس کر دیا تھا کہ بقیہ زندگی میں تلافی کی بھرپور کوشش کی۔

اللہ نے انہیں ایک باعزت مقام عطا کیا تھا مگر زندگی میں سادگی ہی نمایاں رہی۔ اس کی ایک جھلک دکھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ اسٹاف ٹاؤن میں رہائش پذیر تھے مگر یکساں گھر کا نقشہ ہونے کے باوجود بود و باش میں فرق نظر آتا تھا۔ حالانکہ ایک مستقل نوکر کی سہولت موجود تھی مگر سوائے جزوی مدد کے ہمارے گھر میں اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے کا اصول لاگو تھا۔ میں اپنی دوست کے گھر جاتی تو نوکر فوراً ٹرے میں کولڈ ڈرنک اور بسکٹ وغیرہ لے کر آ جاتا اور جب وہ میرے گھر آتی تو کچن سے برف توڑنے کے ساتھ.. میں بھی پیوں گا..... مجھے بھی چاہیے ...قسم کی آوازیں مجھے سخت شرمندہ کر دیتیں... میرے شکوہ کرنے پر امی اہتمام کرتیں کہ شور نہ ہو اور خود بیٹھ کر اس سے باتیں کرتیں... برسوں بعد جب میری وہ دوست ملتی ہے تو بچپن کی یاد تازہ کرتی ہے کہ کس طرح تمہاری امی اپنے ہاتھ سے میری تواضع کرتی تھیں. نوکر کی وجہ سے اس کی امی کچن میں جانے نہیں دیتی تھیں چنانچہ وہ کھانا پکانے کی معمولی شد بد سے بھی محروم رہی... مجھے اس لمحے اپنے والدین پر بڑا فخر محسوس ہوا کہ انہوں نے زندگی گزارنے کی مہارتیں ہمارے اندر پیدا کر کے کس طرح آسانی مہیا کی۔ ہمیں سلائی سکھانے کے لیے بھی امی اور شاید ان سے بھی زیادہ ابا نے جدوجہد کی جس پر ہم آج بلاشبہ فخر محسوس کرتے ہیں ۔میری تحریری صلاحیت بھی سراسر والدین حوصلہ افزئی کی مرہون منت ہے جس نے اعتماد عطا کیا۔

ابا کم گو تھے مگر حد درجہ متحرک! ان کے ساتھی مذاق سے کہا کرتے تھے کہ آپ نے تو پیدل چل چل کر یونیورسٹی کی سڑکیں گھسا دی ہیں... ان کی مہم جوئی ہم سب کو خوفزدہ رکھتی تھی کہ کہیں کسی ٹریفک حادثے کا شکار نہ ہو جائیں مگر ایسا نہ ہوا جب آہستہ آہستہ ان کی چلت پھرت کم ہوتی گئی۔ چلنا، بولنا، کھانا نگلنا.... سارے افعال ایک بچہ درجہ بدرجہ مہینوں میں سیکھتا ہے جبکہ ضعیفی میں اس کے بالکل برعکس یکے بعد دیگرے زوال آتا ہے! یہ ہم نے ابا پر مشاہدہ کیا! دس ماہ میں ایک بچہ زندگی کی طرف دوڑنے لگتا ہے اور وہ کمزور سے کمزور ہوتے گئے اور بالآخر موت سے ہار گئے! اپنی خودنوشت لکھنے کا وعدہ وفا نہ کر سکے! اپنی زندگی کی آخری شام وہ بالکل بچوں کی طرح معصوم نظر آ رہے تھے۔ میں نے بے اختیار ہو کر ان کا بوسہ لیا تھا (بعد میں پتہ چلا کہ حضرت فاطمہؓ بھی اپنے بابا محمد ﷺ کا بوسہ لیا کرتی تھیں تو خوشی ہوئی کہ اللہ نے مجھے نادانستگی میں ہی سہی، ایک سنت پر عمل کی توفیق دی۔ اللہ اسے حق میں حجت بنائے آمین)

ابا کے انتقال سے دو ماہ پہلے امی کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ اس کے بعد ان کی صحت بھی گرتی چلی گئی۔ تمام تر علاج معالجے کے باوجود وہ پہلے کی طرح بحال نہ ہو سکیں۔ پہلے تو معمولی سی بات پر خوش ہو جایا کرتی تھی مگر

اب بڑی سے بڑی بات پر بھی خاموشی کا اظہار کرتیں۔ ابا کی موت کے چھ سال بعد ٹھیک اسی دن، اسی ہاسپٹل میں ہم امی کو شدید نقاہت کے عالم میں لے کر پہنچے تو ہم سب بھائی بہنوں کے کلیجے منہ کو آ رہے تھے مگر زبان پر یہ بات نہ آ رہی تھی۔ وہ پندرہ دن ایڈمٹ رہیں اور ہم آس میں رہے کہ پہلے کی طرح ٹھیک ہو کر واپس آ جائیں گی مگر ایسا نہ ہوا....یکم رجب کو مغرب سے ذرا پہلے میں ان کو تسبیحات پڑھوا رہی تھی۔ مجھے واپس جانا تھا اور اس مہربان سی ڈاکٹر کی ڈیوٹی بھی ختم ہونے والی تھی۔ دل چاہا کہ یہ لمحات ٹھہر جائیں مگر آہ! اس سے پہلے ہی پیام اجل آ گیا۔ امی تو کسی سے معذرت نہ کرتی تھیں اور یہ تو رب کائنات کا بلاوا تھا ...! مجھے ڈاکٹر نے زبردستی باہر بھیج دیا۔ میں روتی ہوئی آئی سی یو سے نکلی تو ٹی وی اداکارہ عائشہ خان اپنے بھانجے کو دیکھنے داخل ہو رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے گلے لگا کر بوسہ دیا اور توجہ دلائی کہ رونے کا نہیں دعا کا وقت ہے کتنی مبارک گھڑی ملی ہے تمہاری ماں کو...! ان کی تسلی نے مجھے ہمت دی سب کو اطلاع کرنے کے لیے موبائل نکالا تو اس پر میاں طفیل محمد کے انتقال کی خبر موجود تھی! دل کو اطمینان ہوا کہ آپ نیک روحوں کے قافلے میں شامل ہوں گی......!

امی تو گویا اس دنیا کی مخلوق تھیں ہی نہیں! کھلے دل کی مالکہ! گھر اور دروازے ہر ایک کے لیے وا! کبھی بھی اور کہیں بھی تالا چابی نہیں! پرس ہمہ وقت کھلا اور زیادہ تر خالی! اکثر خواتین کی نظروں میں امی فضول خرچ تھیں مگر مالی معاملات میں ان کی قناعت اور توکل انہیں بہت زیادہ پریشانی سے بچائے رکھتا تھا۔ امی کی نظر میں اہمیت یادوں، تعلق اور رشتوں کی تھی!

آج کا دور چائلڈ سنٹرڈ ہے جبکہ ہماری امی اپنے زمانے میں اس فلسفہ پر عمل کرتی تھیں جب انہیں اس پر ہر طرف سے ملامت کی جاتی تھی۔ بچوں کو شریک مشورہ کرنے اور ان کی بات ماننے پر نانی اور دادی کی طرف سے انہیں ڈانٹ پڑتی مگر....! ایک دفعہ میری ایک دوست نے حیرت کا اظہار کہ کیا تم لوگ بستر پر مل کر کودتے ہو؟....اور میرے جواب پر کہ نہیں ہم اکیلے اور ڈوئٹ بھی کودتے ہیں ...اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ بلاشبہ ہمارے گھر میں آنے والے ہر بچے کو اتنی عزت ملتی تھی کہ وہ یہاں بلا روک ٹوک آتے تھے۔ رشتہ داروں، پڑوسیوں، دوستوں کے لیے امی ہمہ وقت دستیاب تھیں۔ اپنے میکے میں چھوٹی آپا اور سسرال میں چھوٹی امی کے لقب سے ہر دلعزیز تھیں۔

ہمارے محلے میں دو وائس چانسلر (سابقہ اور موجودہ) رہتے تھے۔ ظاہر ہے ان کا کروفر پروٹوکول کا متقاضی تھا مگر امی جس بے تکلفی اور اپنائیت سے ان گھروں میں جاتیں بہت سے لوگوں کو حیرت ہوتی! وجہ؟ ان کا خلوص اور سادگی کے ساتھ مرعوب نہ ہونے کی صفت! دوسری طرف شمالی علاقے سے تعلق رکھنے والے اثناءعشری کے اژدر خان کا انتقال ہوتا ہے تو اس کے کوارٹر میں سب سے پہلے پہنچنے والی خاتون امی تھیں۔ ان کا خلوص ہر دو جگہ ان کو عزت دلاتا۔ امید ہے کہ ان کی عاجزی ان کو اللہ کے دربار میں بھی بلندی درجات رکھے گی۔ ان شاءاللہ!

ہر دم لوگوں کے لیے دستیاب ہونے کی وجہ سے ہم سب ان سے شاکی رہتے تھے کیونکہ بہر حال کچھ نہ کچھ ضرب تو پڑتی ہی تھی ہم سب پر! (یا اس وقت محسوس ہوتی تھی...!) آپ دوسروں کو ہم پر ترجیح دیتی ہیں...ایک دن میرے شکوے پر وہ بول پڑیں

''.....تمہارا پریکٹیکل امتحان تھا کتنی بارش میں تمہیں لے کر میں گئی تھی .....تمہیں اسلام آباد جانا تھا اگر میں نہ اٹھاتی تو تمہاری فلائٹ مس ہو جاتی......'' میں غصے کے باوجود ہنس پڑی تھی ان کی بات پر! اس وقت کہہ نہ سکی تھی مگر بعد میں اعتراف کیا کہ آپ کے یہ احسانات تو ایسے ہیں جیسے کسی خزانے سے گرے چند موتی! ہماری تو زندگی ہی آپ کی احسان مند ہے (آپ ایک نایاب بلڈ گروپ رکھتی تھیں یہ جان کر اس احسان کا بار اور بڑھ گیا کہ ہم سب کی زندگی کتنا رسک تھی آپ کے لیے!)

اپنے والدین کے لیے یہ احساسات اگرچہ ذاتی ہیں مگر ان کو الفاظ میں ڈھالنے کا مقصد یہ ہے کہ جن کی جنت کے دونوں دروازے یا ایک دروازہ کھلا ہے وہ اس کے ذریعے اپنا داخلہ یقینی بنالیں اور یہ چند الفاظ ہماری بھی نجات کا باعث بن جائیں!

☆......☆......☆

آکاش سے پرے

فارم ہاؤس کی سیر

امریکہ میں جہاں اور بہت سی قابل تعظیم چیزیں نظر آئیں وہیں ان میں vacations (چھٹیوں) کا بہت احترام پایا۔ مجھے یاد ہے ہمیں جاب کے دوران اپنی پرنسپل سے یہی الفاظ سننے کو ملتے تھے کہ چھٹیاں تمہارا حق نہیں ہے یہ صرف ایمرجنسی کیلئے ہیں، اس لیے بعض اوقات کولہو کے بیل کی طرح پورا سال کھپتے ہوئے گزر جاتا کہ کوئی ایمرجنسی نہیں ہوئی تو چھٹی کیسے لیں۔ مگر یہاں نظریہ فرق ہے۔ ہر ایک کو لازماً چھٹی پر جانا ہے تاکہ وہ تازہ دم ہو کر واپس کام پر آسکے۔ اس حوالے سے سال کے شروع میں ہی پروگرام بنالیا جاتا ہے کہ ہمیں کس مہینے میں چھٹی پر جانا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سب نے ہماری آمد پر اپنی وکیشن استعمال کیں لہٰذا بھرپور لطف اٹھانے میں کسی کی جاب یا مجبوری حائل نہ تھی۔

فطرت کے قریب ہونے کے لیے اور پرسکون ماحول میں وقت گزارنے کیلئے میری بیٹی زینب اور میرے داماد اویس نے پہلے ہی RHODE ISLAND میں ایک فارم ہاؤس میں بکنگ کرالی تھی۔ قدرتی مناظر ہمیشہ سے میری کمزوری رہے ہیں شہر کے ہنگاموں اور جگمگاتی روشنیوں سے دور یہ ایک خوبصورت، خاموش، سادہ اور پرکشش علاقہ تھا۔ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا سبزہ آنکھوں کو طراوٹ دے رہا تھا۔ اویس کو کوڈ نمبر بتا دیا گیا تھا اس نے تالا کھولا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ ہر چیز قرینے سے سجی تھی۔ کچن مکمل سیٹ تھا۔ کھانا بنانے کی بھی تمام سہولت میسر تھی۔

یہاں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ سب کچھ میسر ہوگا مگر 'نوکر' نہیں۔ ہمارے معاشرے میں نوکر اس بات کی علامت ہے کہ معاشرہ مساوات اور انسانیت سے خالی ہے۔ نوکر ہمارے نفس کو ہوا دینے کیلئے کافی ہے۔ ایک شخص آپ کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہے اور دوسرا گھمنڈ اور تکبر کے سنگھاسن پر چڑھا ہوا ہے۔ ہاں بھئی اب تم پر لازم ہے کہ تم میری عزت کرو، میرا کام کرو، میری ہر زیادتی کو خاموشی سے سہو کیونکہ میں تمہارا مالک ہوں اور تم میرے ملازم۔ یہاں کوئی ایسا تعلق نہیں ملتا اس لئے ہر شخص خود کام کرتا ہے چونکہ سب خود کام کرتے ہیں اس لیے ایک دوسرے کی عزت بھی کرتے ہیں۔

لہٰذا جلدی جلدی سب نے کام میں حصہ بٹانا شروع کر دیا۔ کوئی کھانا بنا رہا ہے تو کوئی برتن دھو رہا ہے۔ کوئی صفائی میں لگ گیا۔ صرف ہماری مرضی تھی کہ ہم چاہیں تو کام کرلیں اور نہ چاہیں تو ان کو کام کرتے ہوئے دیکھتے رہیں اس لیے بھی کہ ان کے کام کرنے کے طریقے سیکھنے میں بھی ہمیں وقت لگتا تھا۔ ایک صحت مند زندگی اور صحت مند معاشرے میں وقت کی تقسیم کا توازن بہت ضروری ہے۔ ہمیں بچپن سے قائداعظم رحمتہ اللہ علیہ کا ایک قول بہت رٹایا جاتا ہے۔ ''قائداعظم نے فرمایا کام، کام اور بس کام۔'' اور میں یہ کہتی ہوں کہ جتنا کام پاکستانی کرتے ہیں میں نے دوسری قوموں کو اتنا کام کرتے نہیں دیکھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اتنی محنت اور جانفشانی کے باوجود ہمارے لوگ محنت کے ان ثمرات سے محروم رہتے ہیں؟

وجہ صرف وقت کی نامناسب تقسیم اور انسانی صلاحیتوں کا غلط استعمال دراصل یہ بات بیچ میں یوں آگئی کہ اگرچہ یہاں سب کام بہت کرتے ہیں اور یہ خود اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں لیکن اس کام کو اپنے اعصاب پر سوار نہیں کر لیتے اور اس میں ڈوب کر اپنے پرلطف لمحات غارت نہیں کر دیتے۔ دلچسپ ان ڈور گیمز کا بھی اہتمام تھا اگر دو لوگ کھیل رہے ہیں تو باقی بڑی دلچسپی سے دیکھتے اور کھیلنے والوں کو بڑی داد

دی جاتی۔

ایک دلچسپی جو نسل در نسل برقرار ہے وہ تاش کے پتوں کا کھیل ہے چھوٹے بڑے سب بڑی دلچسپی سے کھیلتے، چیٹنگ کرتے اور جیت جانے پر خوب قہقہے لگائے جاتے اور مخالف پارٹی کو چڑایا جاتا کہ انہوں نے چیٹنگ کی۔'' بس کہ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ سب کو یکجا رکھنے اور فیملی ٹائم خوشگوار بنانے کے لیے ایسی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ شروع میں تاش کھیلنا مجھے لغویات میں لگا لیکن اس دوران سب اتنا ہنستے، اتنی خوش گپیاں کرتے اور ان سب کے چہروں کی رونق دیکھ کر میں سوچتی کہ یہ بے ضرر شوخیاں اور مذاق اس سے بہتر ہے جو وقت غیبت اور ایک دوسرے پر نکتہ چینی میں گزارا جائے۔ دل میں دعا کرتی کہ ان کے چہروں کی رونق ہمیشہ قائم رہے۔

امریکہ میں رہنے والے تقریباً ہر فرد کو کھیلوں سے خاص شغف ہوتا ہے۔ اس لئے ہر صاحب خانہ نے اپنے گھر کے Basement میں کھیل کا اہتمام کیا ہوتا ہے۔ عموماً رات کا کھانا کھانے کے بعد گھر والے بلیئرڈ اور ٹیبل ٹینس جیسے کھیلوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اگلے روز ہم سب فارم ہاؤس کے قریب New Port کا علاقہ دیکھنے روانہ ہوگئے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ کوئی طلسماتی دنیا ہے یا حقیقی لوگوں کی بستی ہے۔ اتنا خوبصورت اور صاف ستھرا City تھا۔ کہیں کہیں کوئی انسان نظر آتے تھے وہ بھی لگتا تھا کوئی بُت رکھے ہوئے ہیں۔ کوئی شور، ہنگامہ نہیں، ہارن کی پاں پاں نہیں۔ اتنا سکوت، اتنی خاموشی اور اتنی خوبصورتی کہ آسمان کا رنگ گہرا نیلا تو درختوں کا گہرا سبز۔ ہر منظر کسی آرٹسٹ کی پینٹنگ لگ رہا تھا۔

New Port میں قابل دید وہ Mansions ہیں جن سے لطف بھی اٹھایا جا سکتا ہے اور جن کو دیکھ کر عبرت بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ بڑے امراء اور رئیسوں کے محل ہیں جو کہ حکومت نے جوں کے توں محفوظ کر لئے ہیں یوں سمجھئے کہ اللہ کرے ہمارے ملک سے عوامی انقلاب کے بدلے میں وڈیرہ شاہی اور جاگیرداری نظام ختم ہو جائیں اور ان کے بڑے بڑے محل حکومت قبضے میں لے لے اور پھر عام لوگوں کیلئے اسے تاریخ اور عبرت کا حصہ بنا دے۔

کیا شاندار طرز زندگی تھا۔ یہاں تک کہ کچن کے برتن بھی اسی دور کے اور اسی ترتیب سے سنبھالے ہوئے تھے۔ یہ مینشن دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہر جگہ چوہدراہٹ یکساں ہوتی ہے۔ مگر جب عوام میں شعور آجائے تو پھر ان اونچے کوٹھوں کے مکین زیادہ عرصہ ان میں آباد نہیں رہ سکتے۔

فارم ہاؤس میں شب و روز بہت پر لطف گزرے لیکن جس روز ہمیں وہاں سے رخصت ہونا تھا اس روز بڑے اہتمام سے ایک ایک جگہ کی صفائی کی گئی برتن دھو کر ترتیب سے لگائے گئے۔ تمام جگہ سے کوڑے کرکٹ کی ٹوکریاں خالی کی گئیں اور تمام کوڑا ایک بڑے تھیلے میں ڈال کر باہر رکھا گیا۔ باتھ روم صاف کیے گئے اور تمام تولیے واشنگ مشین میں ڈال کر دھوئے اور پھر انہیں خشک کر کے تمیز سے باتھ روم میں لٹکایا گیا۔ غرض بالکل اسی حالت میں واپس لے آئے جس میں پہلے دن یہاں قدم رکھا تھا۔ کوئی ہمیں چیک کرنے نہیں آیا۔ ہم نے خود لاک کیا اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔

میرا ایک سکارف کسی الماری میں رہ گیا جس کا یقیناً مجھے کچھ خیال بھی نہیں تھا لیکن جب ہم واپس گھر پہنچے تو فارم ہاؤس سے فون آیا کہ آپ کا ایک سکارف یہاں رہ گیا ہے۔ چونکہ سکارف میں ہی اوڑھتی تھی اس لئے مجھے مطلع کر دیا گیا۔ میں نے ہنس کر کہا فون کرنے کی کیا ضرورت تھی سکارف گھر پہنچا دیتے تو بات تھی۔ اسی شام بذریعہ پوسٹ میرا سکارف گھر پہنچ گیا۔

یہ سب باہم ایک اعتبار اور امانت کی کہانی ہے۔ حالانکہ چیز معمولی تھی مگر امانت سمجھی گئی۔ اسی طرح اپنی پاکستانی سوچ کے مطابق میں نے کئی مرتبہ کہا کہ اگر کوئی ہمیں چیک کرنے نہیں آیا تو کیا فرق پڑتا تھا ہم بغیر صفائی کے چھوڑ جاتے۔ لیکن ایسا خیال کسی کے ذہن میں نہ تھا انہوں نے جیسا صاف ہمیں دیا تھا ویسا ہی صاف ہمیں واپس لوٹانا تھا۔

ملک بنانا آسان ہے لیکن قوم بننا بہت مشکل۔ یہ سب ایک قوم کیسے بنے؟ ایک سا عمدہ اخلاق، ایک جیسی سوچ اور ایک جیسا کردار (کم و بیش) انسان کی یہاں بہت قدر و منزلت ہے اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی اقدامات کا بہت احترام۔ مثلاً کسی بلڈنگ میں آپ دروازہ کھول کر پہلے گزر گئے تو اب لازم ہے کہ پیچھے آنے والے کیلئے دروازہ پکڑ کر

کھڑے رہیں جب تک کہ وہ گزر نہ جائے اور اگر آپ نے پیچھے آنے والے کا احترام نہ کیا اور کھڑاک سے دروازہ دوسرے کے منہ پر بند ہو گیا تو اسے آپ کی شدید بدتمیزی شمار کیا جائے گا۔ کسی کی مہربانی پر اس کو شکریہ نہ کہنا کسی کو تکلیف دینے سے پہلے Excuse نہ کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مسکراہٹ یہاں کا خاصہ ہے کوئی پاس سے بھی گزرے گا تو مسکرا کر جائے گا۔ حالانکہ اپنے بھائی کو مسکرا کر دیکھنا بھی اسلام میں صدقہ ہے لیکن ہم یہ صدقہ بھی بڑی بخیلی سے کرتے ہیں۔

تعلیمی نظام

بوسٹن یونیورسٹیوں کا شہر ہے۔ MIT یعنی میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی شہرہ آفاق یونیورسٹی ہے جسے دیکھنے کیلئے مریم بہت بے تاب تھی۔ مریم تو اندر جائزہ لینے چلی گئی اور میں آتے جاتے طلبا و طالبات کے چہروں کے تاثرات کا مشاہدہ کرتی رہی۔ ان کے چہروں کی تازگی اور زندہ دلی بتا رہی تھی کہ تعلیم ان کیلئے بوجھ نہیں ہے تعلیم کے شعبے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے کسی بھی ملک کے تعلیمی نظام میں میری بڑی دلچسپی رہتی ہے۔ یہ تعلیمی ادارے ہی دراصل وہ فیکٹریاں ہیں جو قومیں منظّم کرتی ہیں۔ ایک سی سوچ اور ایک سا ذہن و کردار بنانے میں تعلیمی اداروں کا اہم کردار ہوتا ہے۔ یکساں نظام تعلیم کا ڈھول پیٹتے پیٹتے ہم بوڑھے ہو گئے مگر پتہ چلا کہ پہلے اگر دو نظام کام کرتے تھے تو اب چار ہو چکے ہیں۔ یہاں ہر ٹاؤن کا اک اسکول ہے، جسے آپ سرکاری اسکول کہہ سکتے ہیں۔ اس ٹاؤن کا ہر بچہ یہاں ہے۔ یکساں تعلیم حاصل کرے گا۔ ہر ٹاؤن کے اسکول کا نصاب یکساں ہو گا۔ پرائیویٹ اسکولوں کی تعلیم کسی کا شوق ہو سکتی ہے لیکن مجبوری نہیں کیونکہ ٹاؤن کا ہر اسکول وہی ٹینڈر مہیا کرتا ہے۔ ہمارے سرکاری اسکول اگر ہمارے بچوں کو وہی تعلیم دینے لگیں جو پرائیویٹ ادارے دیتے ہیں تو والدین کیوں اپنی جان اور مال کھپائیں۔

بہرحال بوسٹن میں آئیں اور ہارورڈ یونیورسٹی کا دیدار نہ کریں تو خلش سی رہ جاتی ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی دیکھیں اور محترمہ بے نظیر صاحبہ کی یاد نہ آئے تو یہ ممکن ہی نہیں۔ اگرچہ امریکہ میں بہت اہم مقامات پر بھی میں نے پاکستان اور پاکستانی شخصیات کی نمائندگی نہیں دیکھی لیکن ایک جگہ کچھ مشہور لوگوں کی آواز میں ان کے پیغامات سنائے جا رہے تھے وہیں محترمہ بے نظیر صاحبہ کی آواز بھی یہ پیغام دیتے ہوئے سنی گئی۔

You can kill a man but not ideas.

سنٹرل پارک مین ہیٹن

موسموں کا امریکیوں کی زندگی میں بہت عمل دخل ہے بلکہ میرے خیال میں تو کردار پر بھی ان کے موسم اثر انداز ہوتے ہیں۔ برفباری کے موسم میں یہ موٹے موٹے فر والے کوٹ پہن کر بہت حیادار نظر آتے ہیں لیکن جیسے ہی موسم انگڑائی لیتا ہے اور گھروں اور سڑکوں سے برفوں کی تہیں اترنے لگتی ہیں ویسے ہی ان کے کپڑے بھی اترنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں اگر کسی روز دھوپ نکل آئے تو جنون کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ سب گھروں سے نکل کر باغوں کا رُخ کرتے ہیں۔ ایسی چمکتی دھوپ میں ہم سب نے بھی نیویارک کے سنٹر میں واقع مشہور ''سنٹرل پارک'' جانے کا ارادہ کیا۔

آپ اگر کسی قوم کا صحیح مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں تو عوامی پارک اس کیلئے بہترین مقام ہے۔ ہر طرح کے لوگ آپ کو بغیر کسی رکھ رکھاؤ کے اپنی حقیقی حالات میں نظر آتے جائیں گے۔

جلدی جلدی ضروری سامان گاڑی میں رکھا کیونکہ یہ فکر تھی کہ ایسا نہ ہو موسم کے تیور بدل جائیں اور ہم اس چمکتی دھوپ میں امریکیوں کی خوشیاں دیکھنے سے محروم رہ جائیں۔ گاڑی عمر چلا رہا تھا ابھی تھوڑا سا ہی فاصلہ طے کیا کہ عمر کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ عمر نے جیب سے فون نکالا اور گاڑی چلاتے ہوئے فون سننے لگا۔ ایک لمحے کو میرے دل میں خیال آیا کہ یہ تو غلط بات ہے گاڑی چلاتے ہوئے فون سننا غیر قانونی ہے۔ دوسرے ہی لمحے عمر کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے اور آہستہ سے اس نے کہا ''وہ آ گئے۔'' یہ کہہ کر گاڑی ایک طرف روک دی۔ ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دو پولیس والے ہماری طرف آ رہے تھے۔

''آپ فون سن رہے تھے۔'' پولیس والے نے ادب سے

پوچھا۔

''جی ہاں۔'' عمر نے فوراً اقرار کرلیا۔

پولیس والے اس کا لائسنس لے گئے۔ چھان بین کے بعد واپس کردیا اور عمر کو تنبیہہ کر کے جانے کی اجازت دے دی۔

کیا ''مک مکا'' ہوگیا ہے؟ میں نے حیرت سے کہا۔

''نہیں یہاں کی پولیس کا کام لوگوں کو تنگ کرنا نہیں بلکہ ان کو آسانیاں دینا ہے۔ وہ سابقہ ریکارڈ چیک کر لیتے ہیں کہ کوئی عادی مجرم ہے یا محض کبھی کبھار اتفاق سے غلطی ہوگئی۔ اگر سابقہ ریکارڈ اچھا ہو تو بے جا عوام کو تنگ نہیں کرتے البتہ بڑے جرم پر پوائنٹ مل جاتے ہیں اور اگر آٹھ پوائنٹ ہو جائیں تو لائسنس کینسل ہو جاتا ہے جو کہ اس معاشرے میں کسی بھی شخص کی زندگی کو ساکت کرنے کیلئے کافی ہے۔ اس لیے ہر شخص ڈرتا ہے کہ کہیں اسے پوائنٹ نہ مل جائے۔'' بہر حال اتنی تنبیہہ بھی کافی تھی آئندہ سنبھل کر چلنے کیلئے۔

سنٹرل پارک کا نظارہ دل کو خوش کرنے کیلئے کافی تھا۔ برفوں سے درختوں کی شاخیں آزاد ہوئیں تو انہوں نے رنگ برنگ پھولوں کی کونپلوں سے خود کو سجالیا۔ تقریباً 778 ایکڑ پر پھیلا ہوا یہ باغ 1857ء میں قائم ہوا۔ فطرت تو ہر جگہ خوبصورت ہے لیکن فطرت کی اس خوبصورتی کو نمایاں اور محفوظ کرنے والے قابلِ تعریف ہیں۔ بچے اپنی سائیکلوں پر کہیں اپنے ہم جولیوں کے ساتھ لطف اندوز ہو رہے ہیں تو والدین اپنے بچوں کے ساتھ خوشگوار موسم کے انجوائے کر رہے ہیں۔ عاشقوں کیلئے بھی ایسا موسم غنیمت تھا اس لئے وہ اپنی دنیا الگ بسائے ایک دوسرے میں مگن تھے۔ کچھ تو تمام حدیں پھلانگ کر ہر شے سے بے نیاز سورج کی کرنوں سے غسل کر رہے تھے۔ اب یہ معاشرتی تضادات ہیں کہ کہیں جنون کا نام خِرد ہے اور کہیں خِرد کا نام جنوں۔ ایسے مناظر پاکستان میں میں نے اپنے اس Visit میں دیکھے تھے جب نفسیاتی امراض کی تحقیق کے سلسلے میں ہمیں لاہور جیل روڈ پر واقع پاگل خانے کا مطالعاتی دورہ کرایا گیا۔ کچھ خواتین ایسی ذہنی ابتری کی حالت میں تھیں کہ کپڑوں سے بے نیاز اپنی ذات میں مگن دھوپ میں بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں لیکن ان بے چاریوں کو بالکل تمیز نہ تھی کہ وہ Sun bath لے رہی ہیں۔ اب یہ فیصلہ قارئین کریں کہ خرد اور جنون کی حدیں کہاں تھیں۔

پاکستان میں جب کسی پارک میں جاتی ہوں تو پہلے یہ دعا کرتی ہوں کہ اللہ اس پاک وطن کے پارک آباد رہیں اور لوگوں کے چہروں پر یونہی خوشیاں پھیلی رہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈپریشن کا بہترین علاج فطرت کے قریب ہو جانا ہے۔ موڈ کتنا بھی خراب ہو باغ کا سبزہ، پھولوں کی مہک، خراماں خراماں چلتی ہوائیں خود بخود موڈ کو خوشگوار بنادیتی ہیں۔

درختوں پر کھلتی کونپلوں نے بہار کا اعلان کر دیا تھا۔ ہر چہرے پر خوشی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ لیکن کسی مقام پر بھی پڑاؤ ہمیشہ کیلئے نہیں ہوتا اب ہمیں بھی یہاں سے جانا تھا۔ تھکاوٹ اور وقت کا احساس کر کے ہم چل دیئے۔

مجسمۂ آزادی

جی ہاں پانیوں کے درمیان ایک وسیع وعریض مجسمہ جس کا پہلی نظر میں یہ تعین کرنا ہی مشکل ہے کہ یہ کوئی انکل ہیں یا آنٹی ہیں۔ جو لوگ پنجابی فلمیں یا پشتو فلمیں دیکھنے کے عادی ہیں شاید انہوں نے ایسی تنومند، مردانہ وار عورتیں فلموں میں دیکھ رکھی ہوں اور وہ پہلی نظر میں کہہ دیں کہ یہ ایک عورت ہے۔ مگر یقین کریں کہ ہم تو یہی سمجھے تھے کہ کسی مرد نے مردانہ کپڑے نہ ہونے کی وجہ سے یہ ساڑھی نما کپڑا لپیٹ لیا ہوگا۔ وہ تو تب پتہ چلا جب تعارف کرایا گیا کہ یہ ''آنٹی ہڈی'' ہیں ایک ہاتھ میں کتاب لیے اور دوسرے ہاتھ میں شمع روشن کئے لوگوں کو علم کا پیغام دے رہی ہیں۔ پانیوں کے درمیان کھڑی اس آنٹی کا درست ادراک اس کے پاس جائے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے لگالیں کہ اس مجسمے کے اندر باقاعدہ سیڑھیاں ہیں جہاں سے آپ ان کی مشعل سے سر نکال کر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ جو اگرچہ ہم نہ کر سکے اور اندر کے دیدار سے محروم رہے اس لئے کہ اس شوق کو پورا کرنے کیلئے آپ کو ایک روز پہلے سے بکنگ کرانا پڑتی ہے۔

Found

یہ مجسمہ آزادی دراصل دوستی کا تحفہ ہے جو فرانس کے لوگوں کی جانب سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو 1886ء میں دیا گیا۔ اس مجسمہ آزادی تک پہنچنے کے لیے آپ کو فیری میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ جو بذاتِ خود ایک دلچسپ سفر ہے۔ مخصوص وقت تک آپ کو اس پارک میں چھوڑ دیا جاتا ہے جس کے وسط میں مجسمہ آزادی نصب ہے۔ دو سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا لیکن اس مجسمے کا وقار ختم نہیں ہوا۔ اگرچہ رنگ میں فرق آ گیا ہے۔ آغاز میں یہ پیتل کے اصل رنگ پر تھا لیکن پھر فضا میں کیمیکل ردِعمل سے اس کا رنگ سبزی مائل ہو گیا۔ لیکن کتاب کی عظمت اس بات کی دلیل ہے کہ قومیں علم کی بنا پر ہی ترقی کرتی ہیں۔

شام ہوتے ہی مخصوص وقت پر لوگوں نے واپسی کیلئے فیری میں جانے کیلئے لائنیں بنانی رشوع کر دیں۔ یہ لائنیں جہاں نظم و ضبط دیتی ہیں وہیں ہمت پست کرنے کا سبب بھی بنتی ہیں۔ اتنی طویل لائن دیکھ کر تھکاوٹ کا احساس اور بڑھ گیا کہ نجانے کب تک یونہی کھڑا رہنا ہو گا۔ لیکن اگر آپ ستانے کیلئے لائن چھوڑ کر کہیں جا بیٹھے تو پھر اس کا مطلب ہے کہ لائن میں مزید پیچھے چلے گئے۔ اب آپ سوچئے پاکستان کے فائدے...... کتنا آسان ہوتا وہاں تھوڑا دے دِلا کر فیری میں جگہ رکھوا لیتے۔ عین ٹائم پر ریسٹورنٹ سے اٹھتے اور ان سب احمقوں کو جو لائن میں کھڑے تھے مسکرا کر دیکھتے اور آرام سے گزر کر فیری میں جا بیٹھے۔ لیکن کیا کریں یہاں کوئی VIP کلچر سے واقف ہی نہیں اس لئے مجبوراً ہم جیسے خاص لوگوں کو بھی عام بن کر لائن میں لگنا پڑا۔

کیا یہ پاکستان کا اعجاز نہیں کہ اس نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا ہے۔ ہمارے لیڈر، حکمران، سیاستدان، وزراء، بیوروکریٹس کتنی عزتیں پاتے ہیں صرف اس واسطے کہ وہ پاکستان میں ہیں۔ جونہی پاکستان سے باہر آئیں انہیں آٹے دال کا بھاؤ پتہ چل جاتا ہے۔ اب وہ ٹریفک لائٹس پر بھی کھڑے ہوتے ہیں اور لائن میں لگ کر اپنی باری کا انتظار بھی کرتے ہیں اور تب اس عیش و آرام کو یاد کر کے یہ بھی ضرور کہتے ہیں۔ ''پاکستان زندہ باد''

اٹلانٹک سٹی

اسے آپ روشنیوں کا شہر بھی کہہ سکتے ہیں اور بدنام زمانہ بھی۔ جونہی آپ کسی کو بتائیں گے کہ اٹلانٹک سٹی جا رہے ہیں، وہ گلا کھنکار کر آپ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھے گا اور پھر مسکرا کر کہے گا...... او...... ہو...... اگر آپ کسی خاص ارادے سے نہیں جا رہے تو یقیناً حیران رہ جائیں گے کہ ایسے ردعمل کی کیا ضرورت ہے...... لیکن بات وہی ہے کہ بد اچھا اور بدنام برا۔ یہ بے چارا بھی بدنامی میں بہت نامور ہو چکا ہے۔ مشہور ترین جوا خانے اور عیاشی کے بکثرت ٹھکانوں کی وجہ سے وہاں پر جانے والے کو ایسی ہی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

تاج محل کسینو کا بہت شہرہ تھا۔ دراصل یہ ہوٹل بھی ہے مگر اپنے کسینو کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتا ہے۔ اس کا نام ہمارے لئے بڑا پرکشش تھا۔ انڈیا میں حقیقی تاج محل کا دیدار تو نہ کر سکے سوچا یہاں کے تاج محل سے ہی اپنی دیرینہ خواہش پوری کر لیں۔ بظاہر بلڈنگ اور اندر داخل ہونے کا راستہ بالکل اسی مغلیہ شاہانہ طرز پر بنایا گیا ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اگر شاہ جہاں اس تاج محل کو دیکھ لیتا تو اپنی تعمیر کو کم سمجھتا۔ ہوٹل کے کمروں تک رسائی حاصل کرنے کیلئے اس Cassino کے ہال سے ہو کر گزرنا پڑا۔ یقین کیجئے مجھے تو بالکل بچوں کی Video Games کا ہی منظر لگ رہا تھا۔ اپنی اپنی ویڈیو سکرین کے سامنے بیٹھے لوگ کیا کھیل رہے تھے اور اس سے انہیں کیا مل رہا تھا ہم اس سے بالکل ناآشنا تھے۔ کسی کسی جگہ وہ نمبر والا پہیہ لگا تھا جسے گھما کر کسی خاص نمبر پر رکنے والا جیت جاتا تھا۔ پی پلا کر غل غپاڑہ کرنے والے مدہوش اور بہکے لوگ بھی نظر نہ آئے۔ جو کھیل رہے تھے وہ بھی بڑے مہذب اور ہوش و حواس والے ہی لگ رہے تھے۔ بہرحال لاحول پڑھتے ہوئے اپنے کمروں میں آ گئے۔

ہم لوگ اپنے ملک پاکستان میں دہشت گردوں کے ہاتھوں اس قدر ستائے گئے ہیں کہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہوں دماغ عدم تحفظ کا شکار رہتا ہے۔ اس عالیشان ہوٹل کی لابی میں کھڑی جب اس کی وجاہت دیکھ رہی تھی تو دماغ یہی سوچ رہا تھا کہ کسی جگہ بھی چیکنگ نہیں ہوئی اور نہ سکریننگ مشین سے گزرے۔ ایسے میں تو کوئی بھی دہشت گرد

کچھ بھی تباہی کا سامان چھپا کر لا سکتا ہے۔ خود اپنا وجود بھی دہشت گرد لگ رہا تھا۔ کوئی بھی شک کر سکتا ہے۔ ایک تو پاکستانی دوسرے اس ماحول میں ...... اجنبی اور ہونق لگ رہے تھے۔ بلا مقصد گھومنے والا تو فوراً اس ماحول میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ ایک اور بات بہت اہم لگی کہ یہ لوگ عیاشی میں بھی اپنی نسلوں کی عمر اور ذہن کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اٹھارہ سال سے کم عمر کے افراد یہاں نہیں آسکتے مریم کی نرم و نازک جسامت سے شک ہوا تو باقاعدہ اس کا پاسپورٹ چیک کیا گیا۔

بہر حال ہر مقام سے استفادہ آپ اپنی نیت اور ارادے سے کرتے ہیں۔ اس شہر کی خوبصورتیاں بھی ناقابل بیان ہیں۔ Board Walk کا مزہ پاکستان میں مری کی مال روڈ کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ دونوں اطراف میں شاپنگ کیلئے دکانیں آراستہ ہیں۔ مری کے مال روڈ کی طرح جگہ جگہ کھانے پینے کا بھی اہتمام ہے۔ ایک دکان میں یونہی اشیاء کا جائزہ لیتے ہوئے میرا پرس ایک مگ سے ٹکرا گیا اور وہ گر کر ٹوٹ گیا میں نے گھبرا کر دکاندار کو اس کی قیمت ادا کرنے کی پیشکش کی مگر اس نے مسکراتے ہوئے قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ خوش اخلاقی اور احترام آدمیت ان کے خاص وصف ہیں۔

اگلی صبح ہمیں یہ شہر چھوڑ جانا تھا لیکن یہ جمعہ کا مبارک دن تھا اور ہمیں اپنی عبادت کی بھی فکر تھی۔ یقین جانیے کہ اسی ہوٹل کے زیر سایہ ہمیں مسجد بھی مل گئی۔ یہ بنگلہ دیشی مسلمانوں نے قائم کی تھی۔ چھوٹی سی مگر صاف ستھری مسجد۔ جمعہ کا خطبہ بھی سنا۔ نوجوانوں کی تربیت سے مخصوص تھا۔ یہاں اسلام بہت تیزی سے اپنے قدم جما رہا ہے اس میں زیادہ کردار نوجوانوں کا ہے۔ جو نوجوان اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو جاتے ہیں پھر وہ بڑے راسخ العقیدہ مسلمان نظر آتے ہیں۔ بنگلہ دیش کی خواتین سادہ لباس میں ملبوس مگر خوش اخلاق خواتین تھیں۔ اس سارے سفر میں مجھے یہ بات بہت اچھی لگی کہ جب بھی نماز کا ارادہ کیا بڑی آسانی سے مسجد تک رسائی ہوگئی۔

اُڑن چھو

طویل ترین سفر کی یادیں بھی کیمرے میں محفوظ کرتے رہے۔ پھر اچانک ایسا ہوا کہ کیمرے کے کسی خاص بٹن پر ارشد کا ہاتھ لگا اور کیمرے نے تمام تصاویر ڈیلیٹ کر دیں۔ بچوں کیلئے اور خود ہمارے لئے بھی یہ کوئی سانحے سے کم نہ تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے جیسے کوئی قیمتی سرمایہ لُٹ گیا ہو۔ اب کیسے ان جگہوں پر واپس جایا جا سکتا ہے۔ یہ سب لمحات دوبارہ کیسے آسکتے ہیں۔ اور کیمرہ خاموشی سے صاف شفاف ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ زینب اور مریم نے آنسوؤں کی برسات کر دی سب ہمارے پریشان چہرے دیکھ کر پریشان تھے۔ لہٰذا مسئلہ نوجوانوں کی کونسل میں پیش کیا گیا اور سب نوجوان سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ کوئی سوفٹ ویئر تلاش کیا جائے جس سے کیمرے کی تصویریں Recover کی جاسکیں۔ ارشد خود کو اس معاملے میں بڑا مجرم تصور کر رہے تھے اور ان تصویروں کی Recovery کیلئے کوئی بھی قیمت دینے کو تیار تھے۔

تمام رات زینب اور اویس نے مل کر کام کیا اور صبح خاموشی سے زینب نے مجھے خوشخبری سنائی کہ تصویریں کمپیوٹر پر حاصل کر لی گئی ہیں لیکن ابھی پاپا کو نہیں بتانا۔ لہٰذا مل کر یہ پلان کیا گیا کہ سوفٹ ویئر کی قیمت پاپا کو اتنی بتائی جائے کہ اچھی خاصی پارٹی ہو سکے۔ تقریباً چھ سو ڈالر کی رقم پر سب کا اتفاق ہوا۔ ارشد نے خوشی خوشی یہ رقم دینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس سارے پلان سے عمر بے خبر تھا کیونکہ ہم میں شامل نہ تھا۔

ناشتے کی میز پر ارشد نے عمر سے اس سافٹ ویئر کا ذکر کیا اور اس کی قیمت کا اندازہ پوچھا۔ عمر نے معصومیت سے جواب دیا کہ "ہو سکتا ہے یہ سافٹ ویئر مفت ہی مل جائے۔" زینب نے فوراً اسے SMS کیا۔ "ابے گدھے! کیوں سارا پلان خراب کر رہے ہو اچھی قیمت بتاؤ۔" دوسرے ہی لمحے عمر نے سر اوپر اٹھایا اور سنجیدگی سے ارشد سے مخاطب ہوا۔ "دراصل اس فری سافٹ ویئر کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ تصویر آ بھی سکتی ہے اور ہمیشہ کیلئے غائب بھی ہو سکتی ہے۔ ہاں ایک سافٹ ویئر ہے جس کی ضمانت ہے اور تصویروں کا واپس مل جانا یقینی ہے لیکن یہ ذرا مہنگا ہے اور اس کی قیمت 650 ڈالر ہے۔" عمر کی ایکٹنگ لاجواب تھی اور اس طرح یکا یک Statement بدل دینے پر ہم دل ہی دل میں اسے داد دے رہے تھے۔

لو جی، پچاس ڈالر اور بڑھ گئے۔ ارشد کے چہرے پر فکر کے اثرات ظاہر ہوئے مگر پھر دل بڑا کر کے کہا، کوئی بات نہیں ہر حال میں سارے ٹرپ کی تصویریں ملنی چاہئیں۔

سب اپنے پلان کی کامیابی پر بہت خوش تھے کہ بیٹھے بٹھائے پارٹی کے لئے اتنی بڑی رقم ہاتھ آ گئی۔

لیکن آفرین ہے ان بچوں پر، بعد میں انہوں نے یہ سب رقم واپس لوٹا دی کہ ہمارا ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ دھوکے کی رقم سے پارٹی کریں دراصل یہ اس معاشرے کی سچائی ہی ہے کہ ادارے بھی عوام پر اعتماد کرتے ہیں اور عوام بھی اداروں پر یقین رکھتے ہیں۔

ایک مقام پر زینب اپنے بینک سے رقم نکلوانے گئی۔ ATM استعمال کیا تو اسے پتہ چلا کہ اس کے اکاؤنٹ سے رقم غائب ہے۔ سب کافی پریشان ہوئے کہ امریکہ میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ اس طرح اکاؤنٹ سے رقم کوئی غائب کر دے چونکہ اتوار کا دن تھا اور چھٹی تھی اس لئے صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اگلے روز بینک گئے اور بینک منیجر کو بتایا تو اب ہمارے حیران ہونے کی باری تھی کیونکہ پریشانی تو رفع ہو گئی تھی۔ بینک منیجر نے کوئی تحقیقات میں لمبا چوڑا وقت ضائع نہیں کیا۔ کوئی کاغذی کارروائی کے بعد یہ نہیں کہا کہ دو ہفتے بعد پتہ کریں بلکہ فوراً زینب کی بات کا یقین کرتے ہوئے اس کے نقصان کی تلافی کر دی۔

محمود و ایاز

یہ بڑا عجیب معاشرہ ہے یہاں سب ''محمود'' ہی ''محمود'' ہیں کوئی ''ایاز'' نہیں۔ جی ہاں بہت حیرت ہوئی یہ جان کر کہ یہاں چپڑاسی Peon کی کوئی پوسٹ ہی نہیں کسی دفتر کے باہر کوئی چپڑاسی ''Yes Sir'' کہنے کیلئے موجود نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں کوئی آپ کے نفس کو ہوا دینے کیلئے نہیں۔ یہاں تک کہ افسر خود اپنے لئے چائے بناتا ہے بلکہ جاتے ہوئے اپنے ماتحتوں سے بھی پوچھ لیتا ہے کہ آپ کے لئے چائے بناؤں......؟ ماموں فاروق بتا رہے تھے کہ ان کے بینک میں ایک خاتون اپنے Pet کو لے کر داخل ہو گئیں۔ اس بے زبان نے وہاں گند کر دیا۔ منیجر نے Mob پکڑا اور خود صفائی کر دی۔

ٹاؤن کے میئر کو معاشرے میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن یہ عزت اس کی ذات اور سیٹ کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ اس جذبے کے تحت ہوتی ہے جس سے وہ عوام کی خدمت کرتا ہے لیکن اس کے باوجود میئر سے رابطہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ عام آدمی اس تک باآسانی رسائی حاصل کر سکتا ہے اس کیلئے وقت لینے اور طویل انتظار کی اذیت سہنے کی ضرورت نہیں۔

حمید چچا کو خیال آیا کہ نیا میئر آیا ہے اس سے ملاقات کرنی چاہیے۔ دفتر میں پہنچے اور اس حوالے سے سیکرٹری سے بات کر رہے تھے کہ میئر سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس اثناء میں میٹنگ میں موجود میئر کے کان تک آواز پہنچ گئی کہ کوئی ان سے ملاقات کا خواہاں ہے۔ خود اٹھ کر ان سے ملنے آ گیا۔ نہ میٹنگ کا بہانہ بنایا اور نہ ہی اپنی وقعت بڑھانے کیلئے ملاقاتی کو دو گھنٹے انتظار کرایا۔

ہم بھی عجیب قوم ہیں، اختیار ملنے پر ایسے اینٹھ جاتے ہیں جیسے ماش کی دال اکڑ جاتی ہے۔ لوگوں کی ضرورتیں جب ہمارے قبضے میں آ جاتی ہیں تو ہم ان کے 'رب' بن جاتے ہیں اب ہر ضرورت مند پر فرض ہے کہ ہاتھ جوڑ کر خوشامد کی گولیاں لے کر حاضر ہو اور جو بات صاحب اختیار کرتا رہے اس کی ہاں میں ہاں ملا کر ضرورت مند خوشامد کی گولی اس کے منہ میں ڈالتا رہے تب تو وہ امید رکھ سکتا ہے کہ اس کا کام ہو جائے گا ورنہ بے چارا اپنے کام کیلئے آنیاں جانیاں ہی کرتا رہے گا۔

استاد کسی معاشرے کا معزز ترین طبقہ ہے لیکن ایک پرنسپل ایک استاد کی کیا گت بناتی ہے یہ وہی جان سکتا ہے کہ جسے پہروں پرنسپل کے دفتر کے باہر مودب کھڑا ہونا پڑتا ہو اور پرنسپل اس کی اطاعت کا مزہ لیتے ہوئے فون پر بے کار خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ گاہے بگاہے آنکھ اٹھا کر دیکھ لے کہ وہ ضرورت کا مارا بے وقوف، اطاعت گزار کھڑا ہے۔ پھر جب وہ کافی امتحان میں پورا اتر جائے تو شرف ملاقات کی اجازت دے دی جائے۔ آپ یقین کیجئے میں نے بڑے بڑے عزت والوں کو اس طرح رسوا ہوتے دیکھا۔

یہ پاکستان کے آفیسر کلچر کا ایک حصہ ہے۔ آفیسرز کو یہ تربیت دی جاتی ہے کہ عوام اور خواص میں فرق ہونا چاہیے تاکہ عوام ڈر کر رہیں اور آفیسرز کو خدا بنا لیں جبکہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ گورنر کے گھر کے سامنے ڈیوڑھی (خالی احاطہ) نہ ہو ایسا نہ ہو کہ اسے پار کرنے تک ملاقاتی اس کے رعب و دبدبے کا شکار ہو جائے۔ نجانے ہمارا معاشرہ کب اس سحر سے آزاد ہو گا۔

(جاری ہے) ☆☆☆

حبیب الرحمٰن

خوبصورت اور یادگار نظموں کا شاعر......رحمان کیانی

ایوب خان کا دور حکومت تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب سوشل ازم اور کمیونزم کا چرچا تھا، ایوب خان صاحب کا جھکاؤ کسی حد تک چین کی جانب تھا، پاک چین دوستی کی باتیں ہر محفل کی زینت تھیں، مخالف اور موافق، دونوں ہی فریق گفتگو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے، اس وقت چین اور روس کی قربت کا مطلب سوشل ازم یا کمیونزم کی حمایت ہی سمجھا جاتا تھا اس لئے اکثر ایسی بحث وتمحیص تلخیوں میں بدل جایا کرتی تھی اور بعض اوقات بات چیخ وپکار سے آگے بھی نکل جاتی۔

جب بھی جلسے جلوس نکلتے، کوئی ''ایشیا سبز ہے'' کا نعرہ بلند کرتا گزر جاتا اور کوئی ''ایشیا سرخ ہے'' کا نعرہ بلند کرتا گزر جاتا۔ معاشرہ واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا، ادیب ہوں، شاعر ہوں، ڈرامہ نگار ہوں، سیاسی پارٹیاں ہوں یا ان کے رہنما، الغرض جتنے بھی شعبہ ہائے زندگی ہو سکتے ہیں وہ یا تو ''سرخ'' کہلاتے تھے یا ''سبز''۔ ادبی محافل ہوں یا مشاعرے، ان میں بھی یہی دو رنگ بہت نمایاں نظر آتے تھے، ادیب اور شعرا واضح طور پر دو گرہوں میں تقسیم ہو چکے تھے دائیں بازو والے کہیں، ایشیا کو سبز کہنے اور سمجھنے والے کہیں یا اسلام پسند کہیں، اس قبیل کے ایک مشہور شاعر کا نام ''رحمان کیانی'' بھی تھا۔

رحمان کیانی کو میں نے بہت قریب سے دیکھا بھی ہے اور ان کو سنا بھی ہے، ایک نہایت سادہ انسان تھے، کھلتا ہوا رنگ، کسرتی جسم، مسکراتا چہرہ اور نہایت سادہ لباس میں ملبوس ایک پروقار شخصیت کے حامل انسان تھے، ان کے بیٹے ریحان سے میری دوستی تھی اور یہ دور وہ تھا جب میں سیکنڈری گوانگ طالب علم تھا، گھر ہمارے گھر سے قریب ہی تھا اس لئے اکثر ریحان کے ساتھ میں ان کے گھر بھی چلا جاتا تھا۔

رحمان کیانی پاک فضائیہ میں سارجنٹ کے عہدے پر ہوا کرتے تھے اور ایک سپاہی ہونے کے باوجود اتنی اچھی شاعری کرنا، میرے لئے یہ بات بہت ہی کشش رکھتی تھی اسی لئے میں کوشش کرتا تھا کہ جن جن مشاعروں میں ان کی شرکت متوقع ہے میں ان کو سننے کے لئے ضرور جاؤں۔

رحمان کیانی کا نام اس وقت بہت عروج پر پہنچا جب 1965ء کی جنگ کے بعد ان کی ولولہ انگیز نظموں نے مشاعروں کے شرکا کو گرما کر رکھ دیا، انہوں نے اپنی نظموں میں پاک فضائیہ اور بری افواج کے کارناموں کو جس طرح سمویا اور الفاظ کے خوبصورت موتیوں سے اپنے اشعار کو مزین کیا یہ ان کا ہی حصہ ہے اور یہی چیز ان کی شاعری کو اتنا منفرد کر گئی کہ ان کو اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔

رحمان کیانی کی نظمیں مرصع تو ہوتی ہی تھیں مگر ہوتی بہت طویل تھیں، اپنی نظمیں وہ تحت اللفظی میں پڑھا کرتے تھے لیکن انداز اس قدر دلکش ہوتا کہ مشاعرے کا ہر شریک محو ہو کر رہ جاتا، وہ عام شعرا کی طرح بیٹھ کر کبھی اپنا کلام نہیں سناتے تھے، وہ کھڑے ہو کر پورے ایکشن کے ساتھ اپنا کلام سنایا کرتے تھے، پیر کے پنجوں سے لے کر جسم کا ہر ہر عضو لفظوں کے اتار چڑھاؤ کی تصویر بن جایا کرتا تھا، اپنے کلام کے حافظ تھے اور اپنی یادداشت میں شاید ہی کوئی ثانی رکھتے ہوں، شرکا کے شوق کا عالم یہ ہوتا کہ طویل طویل نظمیں سننے کے باوجود ان کی فرمائشیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں۔

کلام کی روانی، موقع اور ماحول کے مطابق لفظوں کا چناؤ اور اٹھان، ان کی شاعری کا خاصہ ہیں، وہ جس ماحول کی عکاسی کرنا چاہتے،

الفاظ خود بخود انہیں سانچوں میں ڈھل جایا کرتے تھے۔

پڑھتے نہیں ہیں بھول کر اللہ کی کتاب
ہوتے نہیں ہیں چشمہ زم زم سے فیض یاب
مغرب کے میکدوں کی چڑھائے ہوئے شراب
اس درجہ ہو چکے ہیں مسلمان اب خراب
سڑکوں پہ ناچتی ہیں کنیزیں بتول کی
اور تالیاں بجاتی ہے امت رسول کی

اب قارئین ایک اور رخ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

آگے بڑھی جو فوج خداوند ذوالجلال
پایا زمیں نے اوج فلک ہو کے پائیمال
پنجہ کہیں ٹکا تو بنی بدر کی مثال
ایڑی جہاں جما کے رکھی بن گیا ہلال
ٹھوکر اگر لگی تو شرارے بکھر گئے
قدموں پہ غازیوں کے ستارے بکھر گئے

عام گفتگو یا تقریر و تحریر کے ذریعے کسی بھی منظر کی تصویر کشی اس طرح کرنا جیسے قاری اس کو اپنی چشم حقیقت سے دیکھ رہا ہو، شاید اتنا دشوار نہ ہو جتنا دشوار تر اشعار کے ذریعے کسی منظر کی تصویر کشی کرنا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شعرا نے اس حق کو خوب خوب نبھایا ہے اور خاص طور سے ان شعرا نے جن کی پہچان ان کی نظمیں ہیں، رحمان کیانی ایسے تمام شعرا سے کسی بھی طور پیچھے نہیں، وہ ایک سپاہی تھے اس لئے انہوں نے جن جن ہوائی یا بری مناظر کو عملاً یا چشم تصور سے دیکھا ان کی ایسی ایسی منظر کشی کی جس کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ مثلاً وہ ایک ایسے وقت کی منظر کشی کر رہے ہیں جب دشمن کی فضائیہ پاک دھرتی پر حملہ آور ہونے والی ہے اور خطرے کے بگل چیخ اٹھے ہیں تو ہماری فضائیہ کی جانب سے کیا ردعمل ہونے جا رہا ہے، ملاحظہ کیجئے۔

یہ سنا اور فوراً لپکتے ہوئے
دو جواں سال شہباز اپنے بڑھے
ایک لمحہ گزرنے نہ پایا کہ وہ
تھے جہازوں کی ہودوں میں بیٹھے ہوئے
اک اشارہ کیا اور چنگاڑ کر
انجن ان کے جہازاں کے منہ پھاڑ کر
سامنے کی ہوا نگلنے لگے
سرخ شعلے زمیں پر ابلنے لگے
روک ان کی ہٹائی گئی تھی کہ بس
اژدھوں کی طرح پھن پھناتے ہوئے
اپنی ہر سانس میں گرد کی اک گھٹا
آسماں تک زمیں سے اڑاتے ہوئے
آندھیوں کی طرح آجلانہ چلے
بجلیوں کی طرح قہر مانہ چلے
آگے پیچھے یہ اڑنے کے میدان تک
آگے پہنچے تو پھر سے گرجنے لگے
اس قدر زور سے اس قدر شور سے
جیسے آتش فشاں کا دہانہ کھلے
اور دیوار و در کو ہلاتے ہوئے
دندناتے ہوئے سنسناتے ہوئے
آگے پیچھے اڑے پر سے پر جوڑ کر
دور نیلی فضا میں زمیں چھوڑ کر
گھٹ کے جگنو بنے دور جب ہو گئے
آنکھ جھپکی تو وہ بھی کہیں کھو گئے
خِط تسخیر کا اک نشاں چھوڑ کر
دودھیا رنگ کا کچھ دھواں چھوڑ کر

کسی فلسفیانہ استدلال کو شعروں کی زبان دینا اور پھر اس بات کو دل و دماغ کے پور پور میں اتار دینا یقیناً ایک بہت دقت طلب کام ہے، رحمان کیانی نے اپنی شاعری میں اس کو جس خوبی سے نبھایا ہے اس کا جواب نہیں ملا، ملاحظہ فرمائیے۔

ایک تلوار سے پتھروں کا کبھی

کچھ بگڑتا نہیں بلکہ تلوار ہی
ٹوٹ جاتی ہے زخم مکافات سے
چھوٹ جاتی ہے خود ظلم کے ہات سے
لیکن انسان پر ظلم کے ہاتھ کو
روکنا فرض ہے موڑنا فرض ہے
ایک ظالم کے ہاتھوں سے تلوار کو
چھیننا فرض ہے توڑنا فرض ہے
اس سے پہلے کہ وہ اپنی حد سے بڑھے
ہم کو لازم ہے امن و اماں کے لئے
اس کے سینے میں سنگین ہم بھونک دیں
جنگ کی آگ میں خود اسے جھونک دیں

رحمان کیانی کو صرف نظم کا شاعر کہنا زیادتی ہوگی، اس وقت کے ماحول نے بے شک ان کو نظمیں کہنے پر ضرور راغب کیا ہوگا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کی نظمیں نہ صرف ان کی پہچان بنیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ ان کو شہرت کے اوج ثریا کی بلندی سے بھی بلند تر کر گئیں لیکن ان کی غزلیں بھی عام روش اور عامیانہ مضامین سے ہٹ کر تھیں، ان کی لازوال نظمیں اور پھر ان کی دلنشینی نے شرکائے مشاعرہ کے دل میں اس خواہش کو کبھی ابھرنے ہی نہیں دیا کہ وہ ان سے غزلوں کی فرمائش کریں اور اگر وہ خود بھی ایسا کرنا چاہتے تو شاید سامعین ان کو ایسا کرنے سے روک دیتے۔ ان کی غزل کے صرف دو اشعار پیش خدمت ہیں جن سے ان کے منفرد انداز فکر کا پتہ چلتا ہے۔

عقل قد کوتاہ سے اپنے رکھتی ہے معیار بلند
ممبر سے محراب کو اونچا مسجد سے مینار بلند

ہمارا کیا ہے کہ ہم بد نصیب آئینے
نہ اپنا ذوق نہ اپنی پسند رکھتے ہیں

☆......☆......☆

شمیم لودھی

محبت کا گماں گزرے!

کوئی ایسی چمک جس سے دلوں کی تیرگی کم ہو

میری شادی کا آغاز ہی تھا۔ شورکوٹ ایئربیس سے ملنے کیلئے اپنے میکہ آئی تو امی جان نے بتایا محلّہ کے ایک گھر میں چند جوان لڑکیاں اپنے بچوں کے ہمراہ آئیں اور نہایت ہی دلنشین اور عام فہم انداز میں قرآنی آیات اور احادیث بیان کیں۔ ان کے بچوں نے باتمیز اور مودب بن کر محفل میں بھرپور شرکت کی۔ گویا یہ کسی عام گھر میں درسِ قرآن دینے کا انوکھا، نیا اور منفرد انداز کا تعارف تھا میرے لئے......

میری امی جان اہل محلّہ کے بچوں کو ناظرہ قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ اسلام کے بنیادی احکامات ازبر کرواتیں۔ ان کی حیثیت ایک سوشل ورکر کی تھی اب وہ پیرانہ سالی میں ارذال العمر کی زد میں ہیں۔ (قارئین سے صحت کی التجا ہے والدین کیلئے۔ امی جان ۹۰ سال اور ابا جان ۹۵ کی عمر میں ہیں)۔ کئی سال ٹوبہ اور قریبی اپنے گاؤں میں یہ نیک اور مشکل کام تسلسل سے کیا۔ ایک دن امی جان کے ہمراہ انصاف صاحب کی بیگم (اللہ مرحومہ کے درجات بلند کرے مولانا مودودی صاحب کے ابتدائی رفقائے کار میں تھیں) سنجیدہ صدیقی اور حفیظہ چودھری تھیں۔ یوں ان خواتین سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اپنا گھر خریدا تو وہاں ایک روز شدید گرمی میں چند باحجاب خواتین تشریف لائیں۔ حفیظہ چودھری نے بتایا یہ ہیں آپا جان رشیدہ کشور گلبرگ فیصل آباد سے آئی ہیں۔ مگر یہ سب میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ بھلا ان خواتین کو فیصل آباد سے یہاں تک سفر کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

دوسرے روز پیغام تھا ۳ بجے درسِ قرآن ہوگا شامل ہوں۔ مگر کیوں؟ موسم گرم اور چلچلاتی دھوپ، یہ ۱۹۸۱ء کی ایک سہ پہر تھی۔ یہ وقت ہوتا ہے ٹھنڈے کمرے میں پنکھے کے نیچے آرام کرنے کا۔ میرا فہم مجھے سمجھا رہا تھا۔ اپنی کوتاہ علمی یہ باور کروا رہی تھی کہ تم خاندان اور گاؤں کی پہلی گریجویٹ بی ایڈ، بی ایس سی ہو، سب پتہ ہے، وہاں کیا کروگی جا کر۔ تین عدد معصوم بچوں کا ساتھ ہے۔ ان دنوں سواری نمبر ۱۱ (یعنی اپنی ذاتی ملکیت دو ٹانگیں) کا ہی استعمال ہوا کرتا تھا۔ گاڑی وغیرہ کا چکر نہ تھا۔

پھر آپا جان فیصل آباد واپسی سے قبل میرے گھر تشریف لائیں۔ ہمسایوں اور اعزہ واقارب سے رابطہ بڑھانے اور دین کی سمجھ بوجھ خود اور عوام الناس میں بیدار کرنے کی اہمیت واضح کی۔ آپا جان نے ایک فارم پر کروایا، یوں گرفتار ہوئے۔

آپا جان کا قرب، دائمی مسکراہٹ اور معنی خیز باتیں سب کچھ سمجھاتی چلی گئیں۔ ناسمجھی سے سمجھداری کی جانب سفر کا آغاز ہوا جو اب تک جاری وساری ہے۔ لاہور منصورہ میں ایک بار آپا جان کی ساتھ والی کرسی تھی۔ ظاہر ہے ڈائری ہاتھوں میں لازماً ہوا کرتی ہے۔ آپا جان میرے صفحے پر نظر ڈال کر بولیں۔ ''اتنا کچھ لکھ لیا'' اور اپنی ڈائری دکھا کر کہنے لگیں۔ ''میں تو بہت کم لکھ پائی ہوں۔'' یہ انداز بہت بھلا لگا اور بہت کچھ سمجھا گیا کہ علم کا خزانہ ہونے کے باوجود تشنگی برقرار رہے اس علم کی پیاس جو ہمارے قلب وذہن کو حوضِ کوثر کی جانب محوِ سفر بنائے رکھے۔ پورے پاکستان سے تحریکی لڑکیاں اور خواتین آپا جان رشیدہ کے ساتھ رابطے میں محسوس ہوتیں۔

ان تھک اور ہمہ وقت مصروف رہنے والی شخصیت، ہم جیسے کاہل اور سست افراد کو متحرک رکھنے کے گر خوب جانتیں اور سب کے مسائل سن کر اچھا، مثبت حل سامنے لاتیں۔ ایک طالبہ بشریٰ (حفیظہ کی بہن) نے آپا جان کو بتایا کہ میں کالج یونین میں منتخب ہوئی تو سیکولر ذہن کی لیکچرار بولی، یہ موٹے دوپٹے والی سٹیج پر بیٹھی کیا دکھائی دے گی۔ فوراً گویا ہوئیں، اسے بتانا ہوگا کہ ہمارے سروں پر موٹے دوپٹے ضرور ہیں مگر ذہنوں پر جہالت وغفلت کی موٹی دبیز تہہ ہرگز نہیں ہے۔

زندگی کی حقیقت، جوانی آتی ہے اور چلی جاتی ہے اور بڑھاپا آتا ہے تو جاتا نہیں ہے۔ ہماری پیاری آپا جان صاحبِ فراش ہیں۔ بے شمار معنوی اولاد کی ظاہری اور باطنی تربیت کرنے والی ماں ہیں۔ ہمیں دعائیں دیتی ہیں۔ ملنے جائیں تو سب کا احوال پوچھتی ہیں۔ انہیں تو سب یاد ہیں باتیں۔ اور سب کی طبیعتیں بھی۔ میں ستارہ ویلی میں آنے کے بعد لودھی صاحب کے ہمراہ منیاں والا راحیلہ ناز کے گھر ملنے گئی تو میرے شوہر کی قدرے سخت، غصیلی طبیعت انہیں بھولی نہ تھی۔ اپنی مخصوص مسکراہٹ چہرے پر سجائے پوچھ رہی ہیں ''تمہیں مجھے ملانے کیسے لے آئے؟'' آپا جان کے دماغی کمپیوٹر میں تو سب کچھ **feed** ہے۔ بھلا ایسی پیاری ہستی کو ہم ہر وقت کیسے یاد نہ رکھیں!!

کوئی ایسی چمک جس سے دلوں کی تیرگی کم ہو
کوئی ایسی نظر جس پر محبت کا گماں گزرے

(صوفی تبسم)

☆......☆......☆

مجھے جانیے

تزئین فیصل

اپنے آپ کو پہچاننے کا نام علم ہے

اس نے میرے لئے زہر کا پیالہ بخوشی پی لیا تھا۔ میرا پیالہ ابھی تک بھرا ہے۔ پھر ہمارے درمیان وہ تیسرا آیا جس نے مجھ پر اس پیالے کو پینا حرام قرار دے دیا، اور مجھے میرے موجود ہونے کا احساس دلایا۔ آج میرے سامنے تم ہو، اور پھر وہی پیالہ ہے۔ میں۔ جو علم کہلاتا ہوں، تم سے مخاطب ہوں!

اللہ نے مجھے اشرف المخلوقات کی امتیازی خصوصیت بنایا تھا۔ اور میری ہی وجہ سے تم کو فرشتوں سے بھی افضل قرار دے دیا۔ لیکن تم بذات خود میری دولت سے سرشار ہونے کے باوجود دوسروں کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہو کہ کچھ مل جائے تو دولت مندوں میں شمار ہونے لگے۔

میرا وہ عاشق جس کے پاس تم جیسی ہدایت بھی نہیں تھی پھر بھی اس نے مجھے اپنی ہی ذات میں تلاش کیا تھا۔ یہ ۴۱۱ قبل مسیح کا زمانہ تھا۔ یونان میں جمہوریت نے عوام میں خصوصاً نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کر دیا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں تاکہ حکومت اور سیاست کے مسائل کو سمجھ سکیں اور عمومی زندگی میں کامیاب ہو سکیں۔ اس وقت اعلیٰ تعلیم کے لئے کوئی یونیورسٹیاں تو نہیں ہوتی تھیں۔ بلکہ نئی ضرورت کو پیدا کرنے کے لئے نئی جماعت پیدا ہوئی جو سوفسطائی (sophists) کہلائی، یہ لوگ دوسری ریاستوں میں جا کر لیکچر دیا کرتے تھے اور سننے والوں سے اس کی فیس لیا کرتے تھے۔ یہ پیشہ ور علم ترقی پسندی کا پرچار کیا کرتے تھے۔ پرانے خیالات پر تنقید کرتے لیکن نئے خیالات کو بغیر تحقیق و تنقید کے مانتے اور منوانا چاہتے تھے۔

ان کی تعلیم کا نصب العین نوجوانوں کو زمانہ سازی کا ماہر بنانا تھا۔ ان کی زبان میں تیزی اور طراری پیدا کرنا تھا۔ تاکہ نوجوان عوام پر اپنا اثر ڈال سکیں اور ان کی قیادت حاصل کر سکیں اس دور میں اس طلسم کو توڑنے والا وہ ایک آزاد منش درویش صفت بوڑھا تھا جس کو لوگ سنکی سمجھتے تھے، کیونکہ وہ زمانہ سازی کے مذہب کے بجائے حق جوئی اور حق پرستی کے مذہب کی تبلیغ کرتا تھا۔

دراصل وہ مروجہ معانی میں تعلیم نہیں دیتا تھا بلکہ لوگوں میں یہ مادہ پیدا کرتا تھا کہ اس علم کو جوان کے اندر موجود ہے غور وفکر کے ذریعے باہر نکالیں اس کی تعلیم بس اتنی تھی کہ علم جزئیات سے کلیات تک اتفاقی مظاہر سے ابدی حقائق تک پہنچنے کا نام ہے اور اس کے لئے سنی سنائی باتوں کو چھوڑ کر ذاتی تحقیق غور وفکر اور کدو کاش کی ضرورت ہے اور اسی نظریے کے تحت وہ اس وقت کی ترقی پسند تحریک کا مدمقابل اور حریف بن گیا۔ اور اسی نظریے کو زندہ رکھنے کے لئے راہ حق کا یہ جاں باز سالک میرے لئے زہر کا پیالہ پی کر ہنستا بولتا دنیا سے رخصت ہو گیا۔ دنیا کی ذہنی تاریخ میں صحیح علمی طریق فکر کو دریافت کرنے والا یہ موجب سقراط تھا جس کی ساری حکمت کا نچوڑ یہ تھا ''اپنے آپ کو پہچان۔ نیکی علم کا نام ہے''

چودھویں صدی میں وہ دور آیا جب اللہ نے تم پر اور انسانیت اور اس کی صفات خاصہ پر یعنی مجھ پر رحم کرتے ہوئے فرقان حمید اتارا۔

''یہ اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو کہ اس کی آیتیں سناتا ہے۔ ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، بے شک یہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔'' (سورۃ آل عمران ۳:۱۶۴)

اور اپنا معلم حضرت محمد ﷺ کو اس کے عملی نمونے کے طور پر بھیجا جس نے تمہیں کتاب وحکمت سے بتایا کہ ''تم ایک وجود رکھتے ہو اور اس وجود کا علم رکھتے ہو اور موجود ہو۔'' تاریخ گواہ ہے کہ اسی کتاب مقدس کی بدولت مسلمانوں نے علوم کے دفتر تیار کر دیئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں نے اپنے علم کی بدولت ۱۰۰۰ برس تک دنیا پر حکمرانی کی۔

آج تم ہو اور میں ہوں.....! میں زہر کا پیالہ پی نہیں سکتا کیونکہ اب قیامت تک تمہیں ہدایت دینے کے لئے مجھے زندہ رہنا ہے۔ آج اس بات کو سن کر مجھے خوشی ہوتی ہے کہ کل کے مقابلے میں تمہارا آج کا

معیارِ زندگی بڑھ رہا ہے۔تمہاری تعلیم بھی بہت اچھی ہے۔لیکن کیا کل کے مقابلے میں آج تم اچھے انسان بھی بن رہے ہو؟

آج ٹیکنالوجی کے دور میں جبکہ تمام دنیا سمٹ کر تمہارے ہاتھ میں ہے لیکن باوجود اس کے تمہارے ہاں اخلاقی زوال روز بروز بڑھتا نہیں جارہا؟ کیونکہ آج بھی ایک طرف تو سوفسطائیوں کی طرح وہ پیشہ ور معلم ہیں جو بھاری بھاری فیسیں لے کر ترقی پسندی کا پرچار کرتے ہیں۔تو دوسری طرف تم نے مجھے صرف ملازمت کے حصول کا ذریعہ بنالیا ہے۔میرے اس رخ سے کوئی سروکار نہ رکھا جو انسانیت کی راہ میں تمہارا صحیح رہبر ہوسکتا تھا۔جانتا ہوں کہ اس معاشرے میں زندہ رہنے کے لئے تعلیم برائے آمدنی بہت ضروری ہے لیکن ذرا سوچو کہ اگر تمہاری یہ تعلیم تم کو تزکیہ نفس نہیں سکھاتی تو کم از کم اس قابل تو بناتی ہے کہ تم خود دنیا بھر کی کتابیں پڑھ کر بذاتِ خود غور وفکر کر کے وہ اخلاقیات سیکھ سکو، جب کہ تمہارے پاس ہدایت کا سرچشمہ بھی موجود ہے۔لیکن تمہارے دور کا مسئلہ یہی ہے کہ مطالعہ کرنے کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے۔میں تمہاری دسترس میں ہوں اس کے باوجود تم نے مجھ سے استفادہ حاصل کرنے کے بجائے مجھے حل شدہ پرچہ جات سمجھ لیا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ مجھ سے استفادہ حاصل کرنے کے لئے کتابوں کا مطالعہ کرنا ہی کیوں ضروری ہے؟

کیا تم جانتے ہو کہ کتاب یادداشت کی حیثیت رکھتی ہے یہ آپ کو Visualize کرنا سکھاتی ہے۔آپ کے تصور کے خدوخال کو واضح کرتی ہے۔کتاب کا ہر لفظ اپنی گہرائیوں میں نہ صرف ایک پس منظر رکھتا ہے بلکہ لاکھوں دفعہ جو استعمال کیا گیا ہے وہ اتنے ہی مقام اور معنی پیدا کر گیا ہے۔لہٰذا قاری ہر لفظ کو دیکھ کر رکتا ہے اس کا تجزیہ کرتا ہے۔الفاظ نئے ہوں تو ڈکشنری سے ان کے معنی اخذ کرتا ہے پھر یہ لفظ اپنی معنی میں آپ کے شعور کے ساتھ پختگی لے کر آتے ہیں۔مثلاً ایک لفظ ''جنت'' کا تصور چھ سالہ بچے کے نزدیک ایسی جگہ ہے جہاں چاکلیٹ کی نہریں بہتی ہیں، جھولے ہیں، 16 سالہ نوجوان کے نزدیک جنت ایسی جگہ ہے جہاں خوبصورت حوریں یا تمام خواہشوں کا پورا ہونا ہے، جبکہ ایک 40 سالہ آدمی کے نزدیک جنت کا تصور ابدیت اور پرسکون زندگی ہے۔

جبکہ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ مطالعہ نہ کرنے اور صرف الیکٹرانک میڈیا پر بھروسا کرنے والا کبھی بھی اس تخلیقی عمل سے نہیں گزرتا وہ سکرین پر ہر چیز اپنے سامنے مجسم دیکھتا ہے۔ہر پیغام، ہر آواز، ہر واقعہ، ہر تصویر روشنی کی مدد سے اس طرح اس کے سامنے برہنہ ہو کر آجاتی ہے کہ عقل کا استعمال اور غور وفکر کرنے کی ضرورت ہی بہت کم ہوجاتی ہے جبھی تمام Audio Visual چیزوں کو ایک تحلیل ہوجانے والی یادداشت کی حیثیت حاصل ہے۔یہ چیزیں جتنی جلدی اپنا اثر دکھاتی ہیں اتنی ہی جلدی دماغ سے نکل جاتی ہیں۔مثلاً جو ٹی وی پروگرام تم دس سال کی عمر میں دیکھنا پسند کرتے ہو، بیس سال کی عمر میں وہی پروگرام تم کو بچگانہ لگ رہے ہوتے ہیں۔لہٰذا آہستہ آہستہ تمہاری تخلیقی صلاحیتوں کو زنگ لگنا شروع ہوجاتا ہے، پھر تمہاری ذہنی صلاحیت کمزور ہوتی جاتی ہے۔نتیجتاً تم حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھتے ہو، اور تمہاری زندگی صرف سنی سنائی باتوں میں گزرنے لگتی ہے۔آج تم ایک بم دھماکہ ہو جانے کے بعد گھنٹوں بیٹھے اس کی Live Coverage یا اس سے متعلق Talk Show دیکھتے رہتے ہو، اس دھماکے کے پیچھے چھپی ان منفی وجوہات کو نہیں دیکھتے جن کی بدولت آج یہ لاوا پھٹا ہے۔

لہٰذا ہر باشعور فرد سے میرا التماس ہے کہ انسانیت کی خدمت اور میری بقا کے لئے ترغیب ضروری اور اس کا پہلا قدم آپ کا اپنا گھر ہے۔اپنے بچوں کو سونے سے قبل مطالعے کی عادت ضرور ڈالیں اور یہ تبھی ممکن ہے کہ جب والدین خود مطالعہ کریں، اپنی اپنی زیرِ مطالعہ کتاب کو ایک دوسرے سے Discuss کریں اور اپنے بچوں کو غور وفکر کرنا سکھائیں۔بس ایک دو دفعہ کتاب پڑھوائیں پھر جس کو خود سے تخلیق کرنے کا چسکا لگ جاتا ہے، وہ کسی اور کے Vision سے مطمئن نہیں ہوتا، بقول علامہ اقبال:

''تو سرمے کی تلاش میں تیزی سے ادھر ادھر دوڑتا پھرا، یہ خیال نہ کیا **کہ تیری آنکھیں تو خود سیاہ ہیں، جو سرمے کی محتاج نہیں ہوسکتیں''۔**

☆......☆......☆

لمحہ فکریہ

قمر پرویز۔لاہور

آج وہ بہت اداس نظر آرہی تھی۔آنکھیں سوجی ہوئی تھیں لگتا تھا ساری رات روتی رہی ہے۔ہونٹوں سے مخصوص مسکراہٹ بھی غائب تھی۔دوران لیکچر بھی میں نے دیکھا کہ جیسے دل بھر آتا اور آنکھوں سے آنسو امنڈ پڑتے۔موقع ہی نہیں مل رہا تھا کہ اس سے اس کیفیت کی وجہ پوچھوں۔

خیر جب میں نے لیکچر ختم کیا اور کافی لڑکیاں باہر چلی گئیں تو میں نے آہستہ سے پوچھا،''خیریت ہے؟'' اداسی سے کہنے لگی ''میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں آپ کے پاس کب ٹائم ہوگا؟'' میں نے کہا: ''میں فارغ ہی ہوں ابھی بات کر لیتے ہیں۔بیٹھو۔'' وہ جب بیٹھ گئی تو پھر بری طرح رو پڑی۔تھوڑی دیر بعد جب ڈھارس بندھی تو میں نے پوچھا،''کیا ہوا؟'' کہنے لگی ''رات امی نے میری بہت عزتی کی اور بہت بری بری باتیں کیں'' میں نے پوچھا: ''وجہ؟'' تو کہنے لگی ''رات ایک فرینڈ کی سالگرہ پر ایک ریسٹورنٹ گئی تھی واپسی پر گیارہ بج گئے۔بس اتنی سی بات پر امی نے اتنا ڈانٹا اور اتنی بری باتیں کیں۔اگر انہیں اتنی ہی پابندیاں لگانی تھیں تو مجھے کو ایجوکیشن میں کیوں بھیجا وہاں تو سب ایسے ہی کرتے ہیں اور مجھے سب سے الگ نظر آنا پسند نہیں۔''

یہاں میں آپ کو بتاتی چلوں کہ ماہ نور بڑی قابل لڑکی ہے اور ایک مشہور پرائیویٹ ادارے سے اکاؤنٹس کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ والدین پڑھے لکھے دیندار اور کسی مذہبی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔

اچانک بجلی کی طرح ایک سوال میرے ذہن میں کوندا میں نے پوچھا،''یہ فرینڈ جس کی سالگرہ پر آپ گئی تھیں لڑکا ہے یا لڑکی؟'' کہنے لگیں،لڑکا کیوں میڈم اس میں کوئی برائی ہے؟'' میں نے سوال کا جواب تو نہیں دیا البتہ دوسرا سوال پوچھ لیا کہ رات گیارہ بجے آپ گھر کیسے آئیں؟ کہنے لگیں ''ایک لڑکا اپنی گاڑی میں چھوڑ گیا تھا۔ رکشہ پر آتے ہوئے تو مجھے ڈر لگ رہا تھا۔'' بس اتنی سی بات تھی اور اتنا ہنگامہ ہوا۔''

میں کچھ بھی نہ کہہ سکی بس سوچتی ہی رہ گئی کہ واقعی ''بات تو اتنی سی' ہے اور اتنا ہنگامہ کیوں؟ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی جس نے اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک ڈھانپا ہوا ہے۔حجاب بھی کرتی ہے اس کو''اتنی سی بات'' میں قباحت کیوں نہیں نظر آرہی ہے؟ اسے معاشرتی حدود کا علم کیوں نہیں ہے؟ یہ کیوں نہیں جانتی ہے کہ دین اس بارے میں کیا کہتا ہے؟ یا اس کے اندر اتنی ہمت کیوں نہیں ہے کہ جو کچھ وہ صحیح سمجھتی ہے اس پر عمل کرے۔ وہ سوسائٹی کی چمک دمک سے مغلوب کیوں ہو جاتی ہے؟ پڑھے لکھے والدین کی تربیت میں کہاں کمی رہ گئی ہے؟ یہ''لمحہ فکریہ'' ہے پڑھے لکھے والدین اور اولاد کیلئے کہ یہ مضافقت امت اسلامیہ کو کدھر لے جا رہی ہے؟

☆......☆......☆

وہ بیس دِن!

درشہوار قادری۔کراچی

رمضان المبارک کا آخری عشرہ ہے۔دورہ قرآن جاری ہے۔ بیسویں پارے کے بعد سے ہی دل میں عجب سا احساس جنم لے رہا ہے کہ اب یہ محافل اپنے اختتامی سفر کی جانب گامزن ہیں۔ختم قرآن ہوگا اور پھر ہم سب اپنی اپنی دنیاؤں میں گم ہو جائیں گے کسی کو باورچی خانے کی فکر ہوگی کہ لہسن ادرک اور ہلدی مرچ ختم ہو چکا ہے اب منگانا ہے۔کسی کو گھر کے جالے اور درو دیوار کی مٹی جھاڑنے کا مرحلہ درپیش ہوگا۔ہم میں سے شاید کچھ شاپنگ مال کو دوڑیں گے کہ

منی کا دوپٹہ پیکو کرانا ہے اور عید کے کپڑے درزی سے اٹھانے ہیں۔ غرض انسانی سوچ کے دائرے ہر سمت رواں ہونگے۔ پھر ہمیں وہ 20 دن شدت سے یاد آئیں گے جو ہم نے قرآن فہمی میں گزارے۔ اللہ اللہ کیا زبردست گزرے وہ دن۔ شاید کچھ خواتین کے لیے صبح سحری کھانے کے بعد دوبارہ سونے اور پھر 9 یا ساڑھے 9 بجے جبکہ گہری نیند۔ نرم ملائم بستر اور ٹھنڈا کمرہ چھوڑنا (اگر خوش قسمتی سے بجلی ہو تب) کوئی آسان مرحلہ نہیں ہوتا مگر دورہ قرآن کی کشش ہماری ساتھیوں کو لاتی ہے۔ کیا دل نشین محفل کہ خوش لحن قاری کی آواز میں تلاوت جاری ہے۔ خواتین اپنے اپنے قرآن پاک سامنے کھولے ہوئے اپنی اصلاح اور تصحیح کرتی جا رہی ہیں۔ قراۃ کے بعد ترجمہ اور تفسیر ہمارے دل و دماغ کے دریچوں کو کھولتا جا رہا ہے۔ اسی دوران ہماری معلّمہ محترمہ سیمی نذیر، نسرین بھابی، صالحہ اور شاکرہ، متعلقہ سورۃ کا پس منظر، وجہ نزول اور متعلقہ احادیث پر روشنی ڈالتے جا رہے ہیں بہت سی باتیں ہیں جو ہمارے علم میں تھیں ان کا اعادہ ہو رہا ہے بہت سی نئی معلومات ہمارے علم کا حصہ بن رہی ہیں۔ حقیقت ہے کہ یہ بھی قرآن پاک کا اعجاز ہے کہ جب بھی دورہ قرآن میں شرکت کی تو ہر بار نیا لطف، انوکھا مزہ اور ٹھنڈک ڈالنے والا احساس حاصل ہوا ہے (جبکہ شروع میں کراچی کا درجہ حرارت 50 درجے کے قریب جا پہنچا تھا)۔

قرآن پاک سے قربت کا یہ مزہ اس وقت دوبالا ہو جاتا ہے جب رات کو تراویح میں وہی سورتیں سننے کو ملتی ہیں جنہیں ہم صبح دورہ قرآن میں سمجھ کر پڑھ چکے ہیں۔ اللہ بہترین اجر عطاء فرمائے اس محفل کے منتظمین خصوصاً ماجدہ واسع اور روبینہ فہیم کو جو ہر سال اس کارِ خیر کے لئے محنت کرتی ہیں۔ یہ ہم سب کی خوش قسمتی ہے کہ ماہ رمضان میں اللہ ہم سے ہم کلام رہا اور برکتیں اور خیر نازل کرتا رہا۔ کیونکہ حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ جب میرا جی چاہتا ہے کہ اللہ سے راز و نیاز کروں اور اپنے دل کی باتیں کہہ دوں تو میں نماز پڑھنے لگتا ہوں اور جب میرا دل چاہتا ہے کہ میرا مالک مجھ سے باتیں کرے تب میں قرآن پاک پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ بہرحال اب وقت آ گیا ہے کہ ہمارے اند تبدیلی آنا چاہیے اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ وہ تبدیلی جو ہمیں اللہ سے قریب کر دے اور ہماری دعاؤں میں اثر و قبولیت پیدا ہو جائے۔

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

☆......☆......☆

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

ہوسٹل

یونیورسٹی کے ہوسٹل کی وارڈن نے پہلے دن سب لڑکیوں سے خطاب کیا اور ہوسٹل کے قواعد وضوابط سمجھائے۔ کھانے پینے کے اوقات، صفائی ستھرائی، باہم میل جول، اخلاق وکردار کی بابت ذکر کیا۔ ملاقاتیوں کے بارے میں اور عمارت سے باہر جانے اور واپس آنے کے اوقات کی وضاحت کی اور حکم عدولی کی صورت میں سزا، جرمانہ کی وضاحت کی۔ اور زور اس بات پہ تھا کہ آپ لوگ کچھ تھوڑی مدت کے لیے یعنی عارضی طور پر یہاں رہائش پذیر ہیں۔ آخر کار یہ جگہ آپ نے چھوڑ کر اپنے گھر واپس چلے جانا ہے۔ جو کچھ آپ یہاں تاثر چھوڑ جائیں گی وہ ہر کوئی اپنے ساتھ مستقل طور پر لے جائے گا۔ آپ کے پاس دوبارہ اس طرح رہنے اور وضاحتیں کرنے کا موقع نہ ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

یہ کرۂ ارضی بھی تو انسانوں کے لیے ہوسٹل ہے۔ عارضی رہائش گاہ جہاں کھانے پینے سونے جاگنے کے اوقات باہمی میل جول کے آداب کا خیال رکھا جانا چاہیے، ان تمام قواعد وضوابط کی پابندی لازمی ہے جو ''انتظامیہ'' نے مقرر کر دیے ہیں۔ حکم عدولی کی صورت میں سزا اور جرمانہ بھی متعین ہے۔ اس عارضی زندگی میں حقوق العباد کا خیال نہ رکھا تو معاملات درست کرنے کا موقع نہیں ملے گا موت سب سے ناطے توڑ دے گی اور انسان اپنے اعمال کے اثرات چھوڑ جائے گا۔ ہوسٹل کے اچھے طالب علم کا نام دیوار گیر بورڈ پر ایک عرصہ تک لکھا رہے گا۔ اسی طرح انسان اپنی زندگی میں اولاد صالحہ، علم یا کسی اور صدقہ جاریہ کی صورت چھوڑ جائے گا تو دنیا میں اس کا ذکر خیر باقی رہے گا۔ شاید ایسا صالح فرد مرنے کے بعد بھی معاشرے میں زندہ رہتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے اسی کو لمبی عمر کہا جا سکتا ہو۔ کتنے ہی خوش بخت ہیں جو جسمانی طور پر اس ہوسٹل میں کم عرصہ رہے مگر آج تک وہ معاشرے میں اور لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ ان کی نیکیاں پھل پھول رہی ہیں اور غیر موجود ہو کر بھی موجود ہیں۔ اور کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو اس دنیا سے لمبی عمر پا کر رخصت ہوئے لیکن ''نسیاً منسیا'' ہو گئے ہیں۔ بے شک قبر پختہ بنا لی گئی ہے لیکن یہ بھی تو المیہ ہے کہ اس پتھر کے اعمال بھی جامد اور پتھر ہی رہے کہ بس پتھر ہی کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ اور کتنے ہی ثمر دار درخت ہیں جن کی جڑیں نظر نہیں آتیں مگر ان کے اعمال صالحہ کے پھل سے ایک دنیا روحانی صحت حاصل کر رہی ہے۔ وہ صالح اولاد یا علم نافع کی صورت میں آج بھی اپنے اعمال صالحہ میں اضافہ کر رہے ہیں۔ امام غزالیؒ نے فرمایا

جس نے تقویٰ اختیار کیا اس کی ساری فکریں دور ہو گئیں اب وہ آرام سے جدھر چاہے سو رہے۔ جو بات مطلوب تھی وہ حاصل ہو گئی۔ عارضی زندگی میں دائمی فائدہ دینے والے کاروبار میں سرمایہ لگا دیا تو پھر کاہے کی فکر؟

فمن اتقی و اصلح فلا خوف علیهم ولا هم یحز نون

''جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اپنی حالت درست رکھی ایسے لوگوں پہ نہ کچھ خوف ہے نہ غم'' (الاعراف ۷:۳۵)

لطف تو اس بات کا ہے کہ مرنے کے بعد گناہوں میں ملوث ہونے۔ شیطان کے پھندے میں پھنسنے کا خطرہ ٹل جاتا ہے جو نیکیاں اللہ کی رضا جوئی کے لیے کی گئیں وہ برابر اپنے درجے اور ثواب میں اضافہ کرتی رہتی ہیں۔ اللہ کا یہ وہ کرم ہے جس کی گہرائی کو وہ مومن بندے ہی محسوس کر سکتے ہیں جن کو اس مختصر اور عارضی زندگی میں بہت کامیاب نفع دینے والے ابدی کاروبار میں سرمایہ لگانے کی سچی تڑپ ہو۔

آیئے! ہم اپنے اللہ سے ذاتی اور خصوصی تعلق بنا لیں جس کو محبت کہا جاتا ہے جس سے محبت ہوتی ہے اس کے لیے سب کچھ قربان کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور جس طرح کسی وارڈن سے خصوصی اور ذاتی تعلق ہوسٹل میں کچھ اضافی خوشگوار ماحول بنا دیتا ہے۔ اسی طرح اس رب العالمین کی طرف اپنا رخ اپنی زندگی کی سمت اپنی جدوجہد اور بھاگ دوڑ کا ہدف مقرر کر لیں۔ ہم فنا ہو جانے والی ہر چیز کے ذریعے کچھ غیر فانی اعمال کا بندوبست کر لیں۔ اور یہ غیر فانی اعمال اس ذات باری تعالیٰ کے ساتھ وابستگی اس کی رضا جوئی کے بغیر ناممکن ہیں۔ اس لیے کہ اعلیٰ چیز کے ساتھ کم حیثیت کی وابستگی ہو جائے اس کو بھی اعلیٰ سے نسبت ہو جاتی ہے غلام اپنے آقا کی حیثیت ونسبت سے یاد رکھے جاتے ہیں۔

کل من علیها فان و یبقی وجه ربک ذوالجلال و الاکرام.

☆......☆......☆

علامہ ابتسام الٰہی ظہیر

اولاد کے حقوق

اولاد انسان کی زندگی میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اولاد کی قدر صحیح معنوں میں وہ لوگ پہچانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے محروم ہیں۔ اولاد کی عدم موجودگی میں گھر ویران ہو جاتا ہے۔ اور اولاد کی وجہ سے گھر میں رونق اور بہار آجاتی ہے۔ عام طور پر حقوق والدین کے حوالے سے بہت سی قیمتی نصیحتیں اور باتیں سننے کو ملتی ہیں لیکن اولاد کے حوالے سے کم سننے اور پڑھنے کو ملتا ہے۔ چنانچہ آج میں نے ارادہ کیا ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں حقوق اولاد کے حوالے سے بھی کچھ اہم باتیں قارئین کے سامنے رکھی جائیں۔ اولاد کی ولادت سے قبل ہی والدین کو ان کے بارے میں نیک تمنائیں رکھنی چاہیں۔ قرآن مجید نے اس حوالے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت مریم علیہ السلام کی والدہ اور حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر فرمایا۔ ان تمام ہستیوں نے نیک اولاد کی تمنا کی۔ حضرت ابراہیم نے صالح بیٹے کی دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو یوں پورا فرمایا کہ آپ کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شکل میں ایک حلیم بیٹا عطا فرما دیا۔ حضرت مریم علیہ السلام کی والدہ نے ان کی پیدائش سے قبل نذر مانی کہ اللہ تعالیٰ ان کو جو اولاد عطا فرمائیں گے اسے اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لیے وقف کر دیں گی اور ساتھ ہی آپ نے یہ بھی کہا کہ میں اس کو اللہ کی پناہ میں دیتی ہوں شیطان مردود کے شر سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس نذر کو قبول فرمایا۔ اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام نے بھی پاک اولاد کی دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرماتے ہوئے ان کو حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسی فرمانبردار، نیک اور صالح اولاد عطا فرمادی۔ گویا اولاد کی ولادت سے قبل ہی والدین کو یہ دعا مانگی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان کو نیک اولاد عطا فرمائے اولاد کا والدین پر دوسرا حق یہ ہے کہ والدین ان کے اچھے نام رکھیں۔ مسلمانوں کو انبیاء کرام، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات آپؐ کے خاندان اور آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ناموں پر رکھنے چاہیں۔ احادیث مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ''عبداللہ اور عبدالرحمٰن،، بہترین نام ہیں حدیث پاک کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض نام اللہ کی نظر میں ناپسندیدہ ہیں جن میں سرفہرست شہنشاہ ہے۔ ان ناموں سے بھی اجتناب کرنا چاہیے جن میں شرک کی آمیزش ہو یعنی کسی بت یا غیر اللہ کے ساتھ نسبت کی گئی ہو۔ نام رکھنے کے ساتھ ساتھ بچوں سے تکلیف دور کرنے کے لیے ساتویں دن بچے کا عقیقہ بھی کرنا چاہیے۔ عقیقے کے بعد رضاعت بھی بچے کا بنیادی حق ہے۔ صحت مند ماں کو اپنے بچے کو کسی بھی طور پر اس سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔ والدہ کو دو برس تک رضاعت کی مدت مکمل کرنی چاہیے۔

رضاعت کی تکمیل کے بعد بچوں کو اللہ تعالیٰ کے نام اور اچھی باتیں سکھانی چاہئیں اور بچوں کے ساتھ گالی گلوچ اور بدکلامی سے اجتناب کرنا چاہیے۔ بچے عام طور پر ان باتوں کو سیکھتے ہیں جو وہ دیکھتے ہیں یا ان کے سامنے بیان کی جاتی ہیں۔ برے ماحول کے بچوں کی نفسیات پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، چنانچہ بچوں کی کفالت خوشگوار ماحول میں کرنی چاہیے۔ والدین کے باہمی اختلاف کی وجہ سے بچوں کی نفسیات پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ جس گھر میں والدین پیار اور اتفاق سے رہتے ہیں بچوں میں صبر وتحمل اور بردباری پیدا ہوتی ہے اور جن گھروں میں والدین کی آپس میں ناچاقی اور لڑائی جھگڑا ہوتا ہے وہاں بچوں میں احساس محرومی اور تشدد کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔

والدین کو ابتدائی عمر میں بچوں کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے اور حتی المقدور ان کی تربیت کیلئے کوشاں رہنا چاہیے۔ جو والدین اپنی پیشہ ورانہ

Found

مصروفیات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ان کے بچوں کے بگڑنے کے امکانات بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔ بچوں کو غیر مردوں کے ہاتھ تھمانے سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ ہمارے معاشرے میں بڑھتے ہوئے غیر اخلاقی واقعات کا بڑا سبب والدین کی لاپروائی بھی ہے جو اپنے بچوں کو غیر مردوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ پڑھے لکھے خاندانوں کی کئی خواتین بچوں کی پرورش کیلئے خادماؤں کا سہارا لیتی ہیں، یہ خادمائیں ماں کا ہرگز نعم البدل نہیں ہوسکتیں، لہٰذا ماؤں کو حتی الوسع ان کی تربیت کیلئے وقت نکالنا چاہیے۔ اگر مجبوری میں خادمہ رکھنی پڑ جائے تو بھی خادمہ کی نگرانی کرنی چاہیے کہ وہ بچوں کی تعلیم وتربیت صحیح انداز میں کر رہی ہے یا بچوں کے بگاڑ کا سبب بن رہی ہے۔

بچوں کی تعلیم کا بندوبست کرنا بھی والدین کی ذمہ داری ہے۔ والدین کو بچوں کی دینی اور دنیاوی تعلیم کے لئے اچھے تعلیمی اداروں اور اساتذہ کا انتخاب کرنا چاہیے۔ دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن کی تلاوت اور اس کے مفہوم کا شعور فراہم کرنا بھی والدین کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ سات برس کی عمر میں بچوں کو نماز سکھانا انتہائی ضروری ہے۔ نماز سیکھنے کی وجہ سے بچوں میں تنظیم، روحانی کیفیت اور خالق و مالک کی شناسائی کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ نماز کی برکت سے بچے غیر اخلاقی سرگرمیوں سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم کے حوالے سے صرف تعلیمی اداروں پر ساری ذمہ داری ڈال دینا ہرگز درست نہیں۔ والدین کو خود بھی بچوں کی تعلیم سے آگاہ رہنا چاہیے تاکہ بچے کی ذہنی نشوونما اور تعلیمی ترقی کی راہیں ہموار ہوسکیں۔

سکول جانے والے طلبا اور طالبات کی صحبت سے آگاہی حاصل کرنا والدین کی ذمہ داری ہے۔ اچھی صحبت کے مثبت اثرات اور بری صحبت کے منفی اثرات ہوتے ہیں۔ اگر بچے کی صحبت بگڑ جائے تو بچے کی زبان، رویے اور عادات بھی بگڑ جاتی ہیں۔ بچوں کی عادات میں نمایاں تبدیلی رونما ہو تو اس کو مثبت علامت نہیں سمجھنا چاہیے اور ان کی عادات اور رویوں کی نگرانی کر کے اصل سبب تک پہنچنے کی جستجو کرنی چاہیے۔

بچوں کی غیر نصابی سرگرمیوں کا تعین بھی والدین کی اہم ذمہ داری ہے۔ موبائل، لیپ ٹاپ کا استعمال سکول جانے والے بچوں کیلئے مفید نہیں ہوتا۔ ان کے لئے اچھی کتب کا انتخاب کرنا اور ان کو میدانی کھیلوں کی طرف راغب کرنے کے نتائج انتہائی مثبت نکلتے ہیں۔ کمپیوٹر کا غیر ضروری استعمال بچوں کی نفسیات کو مسخ کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ مڈل پاس کرنے والے طلبہ کیلئے مستقبل کی نشاندہی کرنا بھی والدین کی ذمہ داری ہے۔ اس سلسلے میں والدین کو بچوں کی صلاحیتوں اور میلان کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ اگر بچہ کسی اور میدان کی طرف رغبت رکھتا ہے تو جبراً اس کو بدلنا غلط ہے۔ بچوں کی کامیابی پر ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے، لاپروائی پر سرزنش کرنی چاہیے اور ناکامی پر حوصلہ شکنی کرنے کے بجائے ان کی ہمت بندھانی چاہیے تاکہ بچے کی خود اعتمادی میں کمی واقع نہ ہو۔

تعلیم کے آخری مراحل تک بچوں کو پہنچانے کے بعد ان کے لئے اچھے رشتوں کا انتظام کرنا والدین کی ذمہ داری ہے۔ والدین کو اس سلسلے میں بچوں کی پسند ناپسند کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔ اگرچہ ولی کی اجازت کے بغیر کیا گیا نکاح درست نہیں تاہم لڑکی کو نکاح کیلئے مجبور کرنا بھی درست نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا نکاح فسخ کر دیا تھا جس میں لڑکی کے والد نے اس کی ناپسند کے باوجود نکاح کر دیا تھا۔ احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت سے نکاح خاندان، مال، حسن اور دین کی وجہ سے کیا جاتا ہے، تاہم اگر یہ نکاح دین اور اخلاق کی بنیاد پر کیا جائے تو اس کی کامیابی کے امکانات روشن ہوجاتے ہیں۔

والدین کا حسن انتخاب لڑکے اور لڑکی کی زندگی کو جنت بنا دیتا ہے اور والدین کی طرف سے کی جانے والی کوتاہی خاندانوں کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔ والدین کی تربیت اور رہنمائی اولاد کی دنیاوی اور اخروی کامیابی کا سبب اور ان کی غفلت و لاپروائی اولاد کی ناکامی اور بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔ چنانچہ والدین کو اولاد کے مستقبل کو سنوارنے کیلئے اپنی ذمہ داریاں اور کردار احسن طریقے سے ادا کرتے رہنا چاہیے۔

☆......☆......☆

found.